ایک علمی و دینی اور ادبی ماہنامہ

ذکر و فکر (دہلی)

خاص شمارہ

بیادگار: حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ

بانی دار العلوم حرم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ

خواجہ احمد فاروقی

بشکریہ جناب خواجہ زاہد ندیم صاحب
پیشکش:۔ محمد احمد ترازی

ذکر و فکر دہلی

کا یہ خاص اور نادر نمبر جو کہ

مجاہد جنگ آزادی 1857ء

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی ؒ

سے متعلق ہے محترم جناب **خواجہ زاہد ندیم** صاحب

نے فراہم کیا ہے.

اس علمی تعاون پر ہم اُن کے بے انتہا مشکور ہیں

اللہ کریم انہیں اس کی بہترین جزاء عطا فرمائے آمین

محمد احمد ترازی

مجلس ادارت

معاونین ادارت

ناشر

سید طٰہٰ عبد اللہ

قیمت ۵۰ روپیہ (سالانہ)

فی پرچہ ۵/ روپے

غیر ممالک سے ۲۰ ڈالر یا اس کے بالمقابل ہندوستانی روپے میں (ہوائی ڈاک سے)

۱۰ ڈالر یا اس کے بالمقابل سکہ „ „ (بحری ڈاک سے)

خط و کتابت کا پتہ

ZIKR-O-FIKR (Monthly)
G-[illegible], OKHLA, JAMIA NAGAR
NEW DELHI 110025

نوٹ: رقم ڈرافٹ یا منی آرڈر کے ذریعہ ہی ارسال فرمائیں۔ اگر چیک سے رقم بھیجنا چاہیں تو مزید آٹھ روپے مصارف بنک کا اضافہ کرکے بھیجیں۔ نیز ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک مندرجہ بالا پتہ پر بھیجیں۔

ماہنامہ

ذکر و فکر

دہلی

بیادگار: حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ

جلد: ---- (۴) ماہ ستمبر - اکتوبر ۱۹۸۸ء

شمارہ: ---- ۵ - ۶ ماہ محرم - صفر ۱۴۰۹ھ

ترتیب

مضمون	مصنف	صفحہ
۱۔ اس خاص شمارے کے متعلق		۲
۲۔ مذاکرات (۱)	عبداللہ عباس ندوی	۳
۳۔ مذاکرات (۲)	خواجہ احمد فاروقی	۹
۴۔ 'اظہار الحق' اور اس کے مؤلف حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ	مولانا ابوالحسن علی ندوی	۱۲
۵۔ مجاہدِ اعظم حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ	مولانا محمد سلیم کیرانویؒ	۲۴
۶۔ مکہ معظمہ کی علمی تاریخ کا ایک روشن باب 'مدرسہ صولتیہ'	مولانا محمد مسعود شمیم کیرانوی	۶۷
۷۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، اپنی تصنیف اعجاز عیسوی کی روشنی میں	حکیم عبدالقوی دریابادی	۷۹
۸۔ پادری سی۔ جی۔ فنڈر	سید غلام محی الدین	۸۶
۹۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا زمانہ اور اس دور میں عیسائیت کی تبلیغ میں انگریزوں کی سرگرمیاں	محمد ثناء اللہ	۹۱
۱۰۔ ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ کی سازش اور مولانا کیرانویؒ کا بروقت انتباہ	مولانا نذر الحفیظ ندوی	۱۰۷
۱۱۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی۔ ایک کامیاب مناظر	مولانا شفیق الرحمٰن ندوی	۱۲۱

مذاکرات

(۱)

ایک حدیث ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا[۱]:

" انّ الشیطان قد أیِسَ ان یُعْبَدَ فی جزیرالعرب لکن فی التحریش بینھم "

(شیطان مایوس ہوچکا ہے کہ جزیرہ عرب میں اس کی پرستش کی جائے گی، البتہ ان کے درمیان اُکسانے کی کوشش میں وہ مایوس نہیں ہے.)

جس لفظ کا ترجمہ میں نے " اُکسانے میں " کیا ہے، وہ " التحریش " ہے، جس کے لغوی معنی اُکسانے ہی کے ہیں۔

علامہ پٹنی نے مجمع بحار الانوار میں اس لفظ کی تشریح اس طرح کی ہے:

گوہ (ایک پیٹ کے بل چلنے والا جانور۔ عربی میں اس کو " ضب " کہتے ہیں اور عرب اس کو خشکی کی مچھلی کی طرح کھایا کرتے تھے) کو پکڑنے کے لیے اس کے بل کے دہانے پر لکڑی سے اُس کو اُکساتے، وہ سانپ سمجھ کر اپنا دھڑ باہر کی طرف نکالتا۔ جیسے اس کا جسم باہر آتا شکاری اس پر پتھر رکھ دیتے۔ اسی عمل کو " تحریش " کہتے ہیں۔

اپنی جگہ سے کسی چیز کو ہٹا دینا، دھوکے سے اکسا دینا۔ یہ کام ایسے ہیں جن سے شیطان مایوس نہیں ہوا ہے۔ مسلمان خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرسکتے۔ شیطان نے اس کی

---

[۱] صحیح مسلم اور جامع ترمذی دونوں میں یہ روایت موجود ہے، بحوالہ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف۔

کوشش بھی چھوڑ دی۔ لیکن ان کو فتنوں میں ڈالنے، آپس میں لڑانے ان کے اندر شک پیدا کرنے کی مہم جاری رہی اور جاری رہے گی۔

بعض حدیثوں میں فی جزیرۃ العرب کے بجائے اس طرح آیا ہے کہ ان الشیطان قد یئس ان یعبدہ المصلون۔ شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ نمازی، یعنی جو خدائے واحد کے آگے سر جھکا چکے۔ وہ کسی اور کے آگے سر بسجود ہوں گے۔ شیطان کی عبادت کا مطلب ان چیزوں کی پرستش ہے جس پر شیطان اُبھارے۔

تاریخ گواہ ہے کہ یہ حدیث حرف بہ حرف صحیح ہے۔ مانعین زکات سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جہاد کیا اور اس کی ضرورت تھی مگر وہ لوگ کسی اور شے کی پرستش نہیں کر رہے تھے۔ مسیلمہ کذّاب کی کاوش و فریب سے کچھ لوگ مرتد ہوئے مگر وہ کسی غیر خدا کی پرستش میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔

اندلس میں مسلمانوں کے زوال کے بعد ہزار ہا ہزار کی تعداد میں عیسائی مبلغوں نے مسلمانوں کو عقیدہ تثلیث کی دعوت دی، حکومت نے سختیاں کیں، لوگ زندہ دیواروں میں چُن دیے گئے، لاکھوں شہر بدر کر دیے گئے، ان کو ایک موقع پر دعوت دی گئی کہ وہ دو باتوں میں سے ایک بات قبول کر لیں یا تو عیسائیت قبول کر کے اس ملک میں زندہ رہیں یا کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیے جانے کو قبول کریں۔ انھوں نے دوسری راہ قبول کی، پہلی راہ یعنی بے دین ہو کر زندہ رہنے کو قبول نہیں کیا۔

اس حقیقت سے مسلمان کم اور غیر مسلم زیادہ واقف ہیں۔ غیر مسلموں میں یورپ کے صلیبی مبلغین بہت زیادہ آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ ممکن ہے کہ کسی دیہات، دور دراز کے گاؤں میں جہاں چند مسلمان خاندان صدیوں سے جہالت میں گرفتار غیر مسلموں کے ساتھ رہتے ہوئے اپنے دین سے ناواقف ہیں ان میں کسی کو شکار کر لیں۔ لیکن ایسے کسی ایک گھر میں شبخوں مارنے کی ہمت ان میں نہیں پیدا ہوئی جہاں اسلام کی معمولی تعلیم بھی تھی۔

عیسائیوں اور عیسائی مبلغوں اور ان کی سرپرست حکومتوں کو اس امر کا خاصا تجربہ ہے، لیکن پھر بھی حکومت کا نشہ، اور طاقت پر اعتماد اور عیسائی مبلغوں کی تربیت پر غلط اعتماد کی وجہ

سے وہ اپنی کوششوں سے باز نہیں آتے۔ اور ان کی تبلیغی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ مسلمان کو تثلیث پر تو مائل نہیں کر سکتے مگر اس کے اندر خود اپنے دین کے بارے میں شک پیدا کر سکتے ہیں۔ اور اگر ایک مرتبہ شک میں ڈالنے کا حربہ کامیاب ہو گیا تو حملہ کرنے میں کوئی بات مانع نہ ہوگی، جس طرح گوہ (ضب) کو لکڑی سے اکسا دیا گیا اور اس کو شک ہو گیا کہ کوئی سانپ اس کو ڈس لے گا تو پھر وہ اپنا جسم اپنے بل سے باہر نکال دیتا ہے۔

عیسائیوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو انھوں نے اپنا پہلا اور سب سے بڑا حریف مسلمانوں کو سمجھا، مسلمانوں سے ان کی عداوت موروثی تھی، صلیبی جنگوں میں ان کی ناکامیابی ایک ایسا زخم ہے جو آج تک مندمل نہیں ہوا ہے۔ جہاں ان کو موقع ملا انھوں نے سب سے پہلے اپنے آباء واجداد کی ناکامیوں کا انتقام اس قوم سے دل بھر کر لیا جو "ترکوں کے ہم مذہب" تھے۔

انگریزوں کی مسلم دشمنی کا ایک سبب اور ہے، دنیا کے تمام مذاہب میں عیسائیت ہی ایک ایسا مذہب تھا جو عالم گیر دعوت کا مدّعی ہے، دوسرے مذاہب وہ ہیں جو کسی جغرافیائی حد کے اندر اپنے کو محصور سمجھتے ہیں۔ جیسے بدھ، شنٹو، ہندومت، یا ایسے مذہب ہیں جو کسی خاص نسل کے لیے کچھ روایات و رسوم کا مجموعہ رکھتے ہیں جیسے یہودیت، خاص عقائد کو قبول کر کے کسی دین کی طرف مائل کرنے والے قدیم مذاہب میں صرف نصرانیت ہے۔ اس طرح مذاہب کی دنیا میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔ دوسرے مذاہب وہ تھے جن کے پاس کوئی دعوت نہیں تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونیوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

"لَا جَرَمَ أَنَّمَا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ لَيْسَ لَهُ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْآخِرَةِ۔" (سورۂ غافر - ۴۰)

سچ تو یہ ہے کہ (اے فرعونیو!) جس بات کی طرف تم بلا رہے ہو اس کی کوئی دعوت (پیغام) دنیا و آخرت میں نہیں ہے۔

یہی حال یہودیت اور دنیا کے دوسرے ادیان کا ہے۔

اسلام آیا تو اپنے ساتھ ایک عالم گیر دعوت لے کر آیا۔ ایک مکمل دین، کامل شریعت، زندگی کے تمام مشکلات مسائل کا حل بتانے والی کتاب اور تمام تفصیلات عملی وعلمی پر حاوی سنت، جس نے مسیحیت کی مسخ شدہ شکل کو بھی ظاہر کیا، دوسرے ادیان کی تصدیق کی، اور دنیا کے لیے زندگی کا پیغام پیش کیا۔ اس طرح عقیدۂ تثلیث کو ہزاروں میل پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ نصرانیت (عیسائیت) نے اس دین کو حقارت کی نظر سے دیکھا کہ،

یہ کل کے بچے۔ آنکھ ملانے چلے ہیں صدیوں کے آزمودہ قدیم مذہب سے۔

یہ اُمی لوگ، صحرانشیں بدو، اونٹوں کے چرانے والے، تحقیر کر رہے ہیں فارس اور روم کی شہنشاہیتوں کی اور ان کے حکمراں قوم کی۔ جن کے پاس قدرتی وسائل، دولت، علم، حکومت کیا کچھ نہیں ہے۔

اور یہی نہیں مذاہب کی دنیا میں نصرانیت کا حریف بن کر آئے ہیں، مدعی ہیں اس بات کے کہ ان کے پاس کوئی 'دعوت' ہے۔ جس میں زندگی گزارنے کے آداب اور آخرت میں کامیاب ہونے کے اصول موجود ہیں۔

ایک طرف تو یہ طبعی وفطری غیظ وغضب کے جذبات ان کو اندر سے کھولا رہے تھے، دوسری طرف مشیتِ الٰہی نے اپنے فیصلے سنانا شروع کر دیے، عیسائیت کے پایۂ تخت شام اور بیت المقدس پر مسلمان غالب آگئے۔

فارسی شہنشاہیت، رومی سلطنت۔ Persian and Roman empires دونوں سرنگوں ہو گئیں۔

نصرانیوں نے باوجود ہر میدان میں شکست کھانے کے اسلام کو ایک آسمانی مذہب کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا، ان کے دلوں میں اسلام، مسلمان اور پیغمبر اسلام اور صحابہ کی طرف سے تحقیر کا جذبہ موروثی طور پر منتقل ہوتا رہا۔

ایک عالم گیر اور 'صاحب دعوت' مذہب ہونے کی حیثیت سے بھی ان کو زک اٹھانا پڑی، ان کے یہاں خود کیتھولک اور پروٹسٹنٹ گروہوں کے درمیان خون آشام جنگیں سالہا سال بلکہ صدیوں جاری رہیں، یورپین قوموں میں جہاں نصرانیت قبول کی گئی

اپنی سفید رنگت کا امتیاز اور عقلی برتری کے امتیاز کا جذبہ ان کے خمیر میں رہا اس لیے عیسائیت قبول کرنے والے شرقی ممالک کے افراد کا جذبہ ان کے یہاں 'درجۂ دوم' کے عیسائیوں کا رہا، جیسا کہ بعض ممالک میں کچھ لوگ اصل باشندے ہونے کی حیثیت سے 'درجۂ اول کے شہری'' ہوتے ہیں اور کچھ لوگ کہیں اور سے آکر بس جانے والے سکنڈ کلاس شہری' ہوتے ہیں، اسی طرح افریقی ممالک کے کالے عیسائیوں کا چرچ علیحدہ ہوتا ہے، ان کے پرسٹ بھی کالے ہی ہوتے ہیں۔ گویا ان نئے عیسائیوں کو دو طرح کے "خدائی خاندانوں" سے سابقہ پڑا، کالوں کی ہولی فیملی اور گوروں کی ہولی فیملی۔ یہی احساس تھا جس نے موجودہ امریکہ میں ان افریقیوں کو ان سے بیزار کیا جن میں محمد علی جا کا گروپ ہے۔ سیادت خدا کی نہیں، احکام مسیح کے نہیں، تقدس انجیل کا نہیں۔ یہ سب تابع ہیں سفید چمڑی والے یورپین عیسائیوں کے۔

اس کے برخلاف اسلام میں جو داخل ہوا وہ پہلے ہی روز سے تمام فرائض میں شریک اور تمام حقوق کا مالک ہو جاتا ہے، ایک کی دوسرے پر فضیلت صرف 'تقویٰ' کی بنیاد پر ہے۔ چنانچہ دیکھا گیا کہ عیسائی مبلغوں نے جہاں اپنی عمریں صرف کر دیں، لاکھوں ڈالر خرچ کر کے بستیاں آباد کیں، اسکول اور ہسپتال کھولے ہر قسم کی اخلاقی انارکی کی اجازت دی، شراب کھلے بند عام کر دی، بڑے سے بڑے فواحش کو دھو دینے کے لیے ایک اعتراف جرم کافی قرار دیا۔ کسی مالی جسمانی مشقت کا مطالبہ نہیں، ہفتہ میں تھوڑی دیر کے لیے کسی چرچ میں جاکر "سرمن" سُن آئے اور مذہبی زندگی معیاری بن گئی۔ لیکن ان سہولتوں کے باوجود اسلامی تعلیمات میں سے صرف ایک 'اصول مساوات' کو دیکھ کر ان کی ساری کوششیں بیکار جاتی ہیں۔ جب کہ اسلام سراسر عملی دین ہے، روزانہ پنج وقتہ نمازیں، سال میں ایک ماہ کامل روزہ، مال کی زکات اور بشرط استطاعت حج، پھر اخلاقی ذمہ داریاں، بنی نوع انسان کی خدمت کا جذبہ، پڑوسیوں کے حقوق، اتنی پابندیوں کے باوجود لوگ عیسائیت کی تن آسانیاں چھوڑ کر مسلمان ہو جاتے ہیں۔ یہ بات عیسائیوں کے غیظ و غضب میں اضافہ کرنے کا مزید باعث ہوئی۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں اپنے قدم جمانا شروع کیے تو اس کے کارندوں کو معلوم تھا اس زمین پر سب سے زیادہ سخت مقابلہ جو سخت جان قوم کرے گی وہ

مسلمان ہوں گے۔ مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی کے مضمون "غالب خستہ اسد اللہ خاں" میں وہ اقتباسات دیکھیے[1] جو انگریزوں کے انھوں نے نقل کیے ہیں ان سے ایک اندازہ ہوگا کہ اس قوم کو در اصل عناد مسلمانوں سے تھا، مسلمانوں سے ان کا سابقہ صلیبی جنگوں سے لے کر خلافت عثمانیہ کے آخر دور تک رہا۔ اور کبھی ان کا آتش انتقام ٹھنڈا نہیں ہوا، مسلمانوں نے متعدد بار شکستیں کھائیں، اپنے انتشار و افتراق کی بنا پر ان کے چنگلوں میں پھنستے گئے، مگر انتقام کی پیاس نہ بجھی۔ ہندوستان میں ان کو توقع ہوگئی تھی کہ وہ اب پوری طرح سیاہ و سفید کے مالک ہوگئے ہیں، دونوں حربے استعمال کریں۔ حکومت کا زعم اور آتش و آہن کی طاقت اور اس پر مجروح عیسائیت کی مسخ شدہ تعلیمات کی تربیت حاصل کرکے وہ یہاں کے مسلمانوں کو دوہری مار مارنا چاہتے تھے، جسمانی آزار پہنچاتے، پھانسی دیتے، مثلہ بناتے، سور کی چربی جسم میں مل کر درختوں سے لٹکا کر قتل کرکے وہ اپنی قوت تسلیم کرا رہے تھے، ہڈسن نے مغل شاہزادوں کو ذبح کرکے ان کا خون چلوؤں میں لے کر پیا۔ مجازاً نہیں حقیقتاً اس ذلیل حرکت پر بھی اس کی پیاس نہیں بجھی۔ دوسری طرف عیسائی مبلغ پورے ملک میں شتر بے مہار کی طرح دندناتے پھر رہے تھے۔

اس کٹھن وقت میں مسلمان نام کی قوم کس طرح زندہ رہی۔ اللہ کی مشیت نے کن لوگوں کو کھڑا کیا کہ ان مسیحی مبلغوں کا منہ بند کریں، وہ جو توپ کے دہانوں کی طرح آگ اگل رہے تھے، رسالت محمدی پر نار وا حملے کر رہے تھے، قرآن کی ابدیت پر دریدہ دہنی کے ساتھ زہر افشانی کر رہے تھے۔ ایک نہتی اور مجبور و مقہور قوم نے اس طوفان کا کس طرح مقابلہ کیا۔

یہ تفصیلات ایک عالم دین مجاہد کے کردار، خدمات کے آئینہ میں دیکھے جا سکتے ہیں، جو آئندہ صفحات میں آپ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے عنوان سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

---

[1] "ذکر و فکر" بابت ماہ جون ۱۹۶۸ء، مضمون مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی "غالب خستہ، اسد اللہ خاں"

خواجہ احمد فاروقی

مذاکرات

(۲)

ہمارا ادارہ 'ذکر و فکر' کا حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی نمبر شائع کرنا چاہتا ہے' یہ ایک قرض ہے جو ہمیں اُتارنا ہے۔ اب تک ہم نے مولانا رحمت اللہؒ، مولوی آلِ حسن اور ڈاکٹر وزیر خاں وغیرہ کو مناظرے کے جانباز سپاہیوں کے طور پر دیکھا ہے، میرا نظریہ اس سے مختلف ہے۔ یہ حضرات انگریزوں کے خلاف جو تحریک تھی اس کے بڑے اہم رکن تھے اور اس تحریک کے بہت سے اہم پہلو تھے۔ ان میں سے بعض نے اسلام کی مدافعت کی اور اس کو مسیحی حملوں سے بچایا۔ بعض نے تعلیم میں انگریزوں کی زبان اور تہذیبی اقدار کی مخالفت کی۔ بعض نے سماجی سطح پر انگریزوں کا مقاطعہ کیا اور میدانِ جنگ میں ان کا ایسی جوانمردی سے مقابلہ کیا کہ دشمن بھی عش عش کرنے لگے۔ اس مخالفت میں اہلِ شمشیر اور اہلِ قلم، علماء و مشایخ، امراء و عوام، صنعت کار اور کاریگر سب ہی طبقے شریک تھے اور یہ کہنا غلط ہے کہ یہ صرف چند سپاہیوں کی بغاوت تھی۔ اِس تحریک کا رشتہ بالاکوٹ، ویلور، صادق پور، بنگال، دہلی اور "غدر" سے اتنا ہی گہرا ہے جتنا پادری فنڈر سے۔

یہ مناظرے ۱۸۴۲ء میں لکھنؤ میں شروع ہوئے اس کے بعد مرکزِ ثقل آگرے منتقل ہو گیا۔ ۱۸۴۳ء سے ۱۸۵۵ء تک آگرہ اِن مناظروں کا خاص مرکز رہا اور مسیحی مبلغین نے مسلمانوں کی دل آزاری میں کوئی کسر اٹھا کے نہیں رکھی۔ ترسیل اور ابلاغ کے جو نئے طریقے نکلے تھے ان سے پادریوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ میں اپنے رسالے اور کتابچے چھاپ کر مفت تقسیم کیے۔ جلسے منعقد کیے اور خوب خوب زہر اگلا۔ اکثر مبلغین کی امداد کے لیے انگریزی پولیس اور فوج کے انگریز افسران موجود رہتے تھے۔ کبھی کبھی ان کو اس طرح سلامی دی جاتی جیسے کوئی بادشاہِ وقت آرہا ہو۔

۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ نے تبلیغی عیسائیوں کے لیے دروازے کھول دیے تھے اور پروٹسٹنٹ اور چرچ مشنری سوسائیٹیوں نے شمالی ہند میں اپنا اقتدار جمالیا تھا۔

شروع شروع میں مسلمانوں نے اِن پادریوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ وہ ایک عالم گیر مذہب اور ایک عظیم الشان تہذیب کے وارث تھے اور عیسائیوں کی اِن گھٹیا باتوں کا جواب دینا دونِ مرتبت سمجھتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے فتویٰ دیا کہ وہ سارا علاقہ ہگلی سے دہلی تک جو انگریزوں کے زیرِ اثر ہے دارالحرب ہے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ انگریزوں کے خلاف لڑیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کو انگریزی زبان بھی سیکھنا چاہیے تاکہ وہ ان کی مذموم حرکتوں سے باخبر رہیں۔ انھوں نے کسی مرحلہ پر نہ ہندوؤں کے خلاف کوئی لفظ کہا اور نہ سکھوں کے خلاف۔ ان کا روئے سخن قطعاً انگریزوں کے خلاف تھا۔ ان کے پوتے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے کلکتہ میں دس ہزار انگریزوں کے سامنے قرآن پاک کی چند آیات کی تفسیر بیان کی اور ایک لفظ ہندوستان کی اکثریت کے خلاف نہیں کہا۔ یہی بات بہادر شاہ ظفؔر نے بھی کہی تھی کہ:

"ہمارا جہاد انگریزوں کے خلاف ہے، ہندوؤں کے خلاف نہیں۔"

انگریزوں نے مشرقی علوم کے مدرسوں کے تباہ کرنے کی مہم بھی شروع کی اور جو انگریزی مدرسے قائم کیے ان میں اِس قسم کے سوالات پوچھے جاتے تھے کہ تمھاری شفاعت کون کرے گا؟ اس کا جواب تھا عیسیٰ ابن مریم۔ اگر جواب ذرا مختلف ہوا تو نمبر صفر دیا جاتا تھا کہ تمھارا خدا کون ہے؟ جواب تھا: یسوع۔

یہ حالات تھے جن کو سرسید اور میجر جنرل گراہم نے بھی بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ غدر کی آگ بھڑکانے میں ان عیسائی مشنریوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ لیکن جب یہ "پاکی داماں" کی حکایت بہت بڑھ گئی اور عیسائی مبلغین اپنے تبلیغی رسالے قلعہ معلیٰ تک بھیجنے لگے اور ماسٹر رام چندر اور سائمن فریزر نے بے سروپا اعتراضات کی بارش شروع کردی اور کھلم کھلا

یہ کہنے لگے کہ نعوذ باللہ "جو کتاب اسلام کے رسولؐ نے دنیا کو دی ہے، اس کا کلام اللہ ہونا ظاہری اور باطنی سند سے خارج ہے۔" (ملاحظہ ہو مخطوطہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ نمبر Ms. Mill -217) تو محمد کاظم علی سجادہ نشین درگاہ حضرت سلیم چشتیؒ، سید رحمت علی[1] اور رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی کے جد امجد مولانا آل حسن نے ۱۸۴۲ء میں پادری فنڈر کو باقاعدہ چیلنج کیا اور پبلک مناظرہ کی دعوت دی لیکن پادری فنڈر کا تبادلہ پشاور کو ہوگیا، اور مسیحی سرگرمیاں نسبتاً ہلکی پڑ گئیں، مگر ان شرارت انگیز رسالوں نے تمام فضا کو پہلے ہی مکدر کر دیا تھا اور "غدر" کے لیے زمین ہموار کر دی تھی۔ یہ لاوا بہت دنوں سے پک رہا تھا جو مئی ۱۸۵۷ء میں پھٹ پڑا۔ آگرہ کے جج Charles Raikes نے صحیح لکھا ہے کہ یہ بغاوت فوجیوں سے شروع ہوئی لیکن بعد میں عوامی بغاوت میں بدل گئی۔ ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور ان کے ساتھیوں کی سرگرمیوں کو آزادی کی تحریک کے بڑے مرقع میں سمجھا جائے۔

---

[1] یورپین زبانوں میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور سید رحمت علی کو اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ لوگ دونوں کو ایک ہی شخصیت سمجھنے لگے ہیں، حالاں کہ سید رحمت علی وہ ہیں جن سے صرف خط و کتابت ہوئی تھی اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے باقاعدہ زبانی مناظرہ کر کے شکست دی جس پر انگریز مؤرخین پردہ ڈالنا چاہتے ہیں اور بجائے مولانا رحمت کیرانوی کے صرف سید رحمت علی کا نام لیتے ہیں تاکہ پادری فنڈر کی شکست کا ذکر نہ آنے پائے۔

اظہار الحق اور اس کے مؤلف
حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ

میرے لیے یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ چند سطریں ایک ایسے جلیل القدر عالم دین کے بارے میں لکھوں جس کو اللہ نے قلعۂ اسلام کا محافظ بنایا تھا، جس کی ذات سے حق و صداقت کو فتح و نصرت حاصل ہوئی جس کی عالمانہ بصیرت سے شکوک و شبہات کا ازالہ ہوا، اور جس نے اسلام کی وکالت و حمایت کا فرض ان نازک حالات میں انجام دیا جس وقت اس طرح کا کام اپنی موت کو دعوت دینے کے مرادف تھا اور بغیر جان کی بازی لگائے کوئی اس میدان میں ایک قدم آگے بڑھ نہیں سکتا تھا۔

میرا اشارہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی طرف ہے (سن پیدائش ۱۲۳۳ھ، وفات ۱۳۰۸ھ، تدفین جنۃ المعلاۃ، مکہ مکرمہ) جنھوں نے اپنے عیسائی حریف کو مناظرہ میں شکست فاش دی اور ایسے دلائل سے کام لیا جن کی طرف عام طور پر ذہن نہیں منتقل ہوتا تھا، تیرہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں ان کی شہرت بام عروج پر تھی، وہ اپنے فن میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، جس کا اعتراف ان کے تمام معاصر علماء کو تھا اور آج تک عالم اسلام کا ہر پڑھا لکھا اور باخبر آدمی ان کے کارنامے سے واقف اور ان کی علمی عظمت اور مجاہدانہ کارنامہ کا قائل ہے۔

مولانا کیرانویؒ کا وہ عظیم کارنامہ جس نے ان کو علمائے سلف اور مجاہدین امت کے درمیان ممتاز مقام عطا کیا، یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی مدافعت اس طرح کی کہ حق و باطل کو آئینہ کی طرح روشن کر کے دکھا دیا، اسلام کے خلاف غلط بیانیوں، تہمتوں اور شکوک و اوہام کا طوفان دشمنوں نے کھڑا کر دیا تھا۔ مولانا نے نہ صرف یہ کہ ان تہمتوں کی حقیقت واضح کر دی

بلکہ مسلمانوں کے اندر دین پر یقین واعتماد کو پختہ سے پختہ تر کر دیا، مسلمانوں کو اپنے دین کی صداقت اور اپنے رسول کی لائی ہدایت پر از سر نو غیر متزلزل ایمان نصیب ہوا۔

حضرت کیرانویؒ نے یہ خدمت ایسے زمانہ میں انجام دی جو مسلمانوں کے لیے انتہائی نازک اور صبر آزما زمانہ تھا، ان کا حریف وہ تھا جس کو اس زمانہ کے سب سے بڑے فاتح گروہ کی پشت پناہی حاصل تھی، اور وہ بڑی دنیاوی طاقت اس کی سرپرست تھی جس کے قلمرو میں آفتاب نہیں غروب ہوتا تھا، اور جس کے تمدن، تہذیب، تعلیم کی پوری دنیا میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

دوسری طرف مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، اپنے حریف کے برعکس، ایسی قوم کے فرد تھے جو شکست خوردہ بھی تھی اور شکستہ دل بھی، اور آزمائش کے سنگین ترین وقت سے گزر رہی تھی، اس کو اپنے تابناک ماضی کا بھی ہوش نہیں تھا، اس کے نزدیک اسلاف کے مجاہدانہ کارنامے قصۂ پارینہ تھے جو اس کی سیاسی پسپائی اور اقتصادی بدحالی کا مداوا نہیں بن سکتے تھے، اور اس ذہنی پسپائی کے نتیجہ میں خود دین اسلام کی صداقت وحقانیت پر یقین میں کمزوری بلکہ کھوکھلا پن آچکا تھا، انگریز اس کو اپنا حریف اور حقیقی دشمن سمجھتے تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ ایشیا اور افریقہ میں کہیں بھی ان کے دین وتہذیب کو کوئی علمی محاذ پر چیلنج کر سکتا ہے تو وہ صرف مسلمان ہیں۔ اس لیے ان کا سارا زور مسلمانوں کی حوصلہ مندیوں کو مٹانے اور ان کی معنوی قوت کمزور کرنے پر صرف ہو رہا تھا، یورپ کی عیسائی مشنریاں پوری آزادی کے ساتھ حکومتِ وقت کی سرپرستی اور کفالت میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں اپنے جال بچھائے ہوئے تھیں، ہزاروں کی تعداد میں عیسائی مبلغین ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تھے، سیکڑوں ناخواندہ اور نیم تعلیم یافتہ افراد "اقبال مند فاتح قوم" کا مذہب اختیار کر رہے تھے، اور ان کی ظاہری شان وشوکت، حکومت وقوت، کمزور وناخواندہ اشخاص کے نزدیک حقانیت کی دلیل تھی۔

عوام اور سادہ لوح لوگ تو الگ رہے، خود علمائے کرام کو عیسائیت کی پوری حقیقت نہیں معلوم تھی، ان کو بائبل کے عہد قدیم، عہد جدید، ان کی شرحوں اور تفسیروں سے واقفیت

نہیں تھی، ان کتابوں کی تاریخ اور ان میں جو مختلف زمانوں میں اضافے ہوتے رہے، اور کتر بیونت کی جاتی رہی، بائبل سوسائٹیوں نے جو تصرفات کیے، عیسائی' انجیل مقدس انجمن' نے جس طرح بائبل کو ایڈٹ کیا، ان سب سے سطحی واقفیت بھی پڑھے لکھے مسلمانوں کو نہیں تھی، علمائے کرام کی ذہنی جولانیوں اور علمی تحقیقات کے میدان یا تو فقہی جزئیات تھے یا یونانی منطق وفلسفہ اور علم کلام کی بحثیں، یا کسی درجہ میں احادیث وتفسیر پر حواشی وتحقیقات، عیسائیوں کے ان ناروا حملوں کا مقابلہ کرنے کی کوئی تیاری انھوں نے نہیں کی تھی۔ یہ حملے ان کے لیے ایسے تھے جیسے کسی نے اچانک رات کی تاریکی میں ان کے گھر پر شبخون مارا ہو، ان حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑے دل گردہ کی ضرورت تھی، ہمت وجرأت کے ساتھ کتب سماویہ پر گہری نظر کی ضرورت تھی، اور اس بات کی ضرورت تھی کہ عیسائیت کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہو اور عیسائیت کو عیسائیت کے بنیادی اور علمی مراجع سے سمجھا گیا ہو، جو ان پر تنقیدیں کی گئی ہیں اور ان کے تجزیے جس انداز میں کیے گئے ہیں ان سے واقفیت بھی لازمی تھی۔ ان سب کے لیے ایک طرف تو بھرپور غیرت ایمانی کی ضرورت تھی، دوسری طرف وسیع مطالعہ اور بصیرت مطلوب تھی، اور خاص مشکل یہ تھی کہ عیسائیت پر تحقیقی کام کرنے والے کے سامنے کوئی روشن شاہراہ نہیں تھی بلکہ ایک سُرنگ تھی جو اندر سے تاریک تھی اور اس میں پیچ در پیچ راستے تھے، کھانچے اور کھائیاں تھیں، یعنی اس کے علمی مآخذ نہ ہونے کے قریب تھے، اور جو تھوڑے بہت تھے وہ یورپین زبانوں میں تھے، ان زبانوں میں زیادہ مانوس زبان انگریزی تھی، اہل ہند نے ابھی اس زبان کو سیکھنا شروع ہی کیا تھا اکثر مسلمان اور خاص طور پر علماء اس سے متنفر تھے کیوں کہ یہ ان ظالموں کی زبان تھی جنھوں نے ان سے حکومت چھینی تھی اور ان کی تذلیل کی تھی، دوسری طرف خود عیسائی مشنریاں بھی نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی کتاب مقدس پر جو جرح ہوئی ہے اور اس کے جو تجزیے کیے گئے ہیں وہ ہندوستان لائیں، کیوں کہ ان کی مصلحت تبلیغ کا تقاضہ یہ تھا کہ لوگوں کو اس سے بے خبر رکھا جائے، لہٰذا وہ یہاں کی لائبریریوں اور علمی مراکز کو ایسی کتابیں کیوں کر فراہم کرسکتے تھے بلکہ ان کی کوشش تھی کہ اس طرح کی کتابیں اس ملک میں آنے نہ پائیں۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے لیے یہ صورت حال پریشان کن ضرور تھی مگر ان کی حمیت وغیرت کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ اور ان کے وہ رفقار جو اسلام کی مدافعت اور اسلام پر عائد کردہ تہمتوں کی حقیقت واضح کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکے تھے، اپنے مورچہ پر جم کر مقابلہ کریں، عیسائی مُبلغوں نے جو اپنے آپ کو مُبَشِّر (جنت کا مژدہ سنانے والے) کہلانا پسند کرتے ہیں، مسلمانوں کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دیا — اور تجربہ کار وسیاسی بازی گروں اور امور جنگ کے ماہرین کا خیال ہے کہ مقابلہ کرنے کے لیے بہترین پوزیشن حملہ آور کی ہوتی ہے۔ اپنے حریف کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دینا بڑی مہارت کا کام ہے، یہی سیاست عیسائی مُبلغوں نے اپنی طاقت کے زور پر اختیار کی تھی۔ مگر مولانا کیرانوی نے اپنی دینی بصیرت سے محسوس فرمایا کہ عیسائیوں سے دو بدو مقابلہ ضروری ہے ورنہ نہ صرف ہندوستانی[1] مسلمان ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہوجائیں گے بلکہ عرب ممالک کو بھی انہی خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا، لہذا ہندوستان میں عیسائیوں سے مقابلہ صرف یہاں کے مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ تمام عرب اور اسلامی ممالک میں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ اگر یہاں کے مسلمان جو سیاسی لحاظ سے پسپا ہیں اور اپنی سلطنت کھو کر شکستہ دل ہیں، اگر اس مورچہ پر بھی شکست کھا گئے، اور اس زبانی مناظرہ میں اپنے حریف کا کھوکھلا پن ثابت نہ کر سکے تو عیسائیت کا سیلاب پورے عرب اور مشرقی ممالک کو اپنی پیٹ میں لے لیگا۔ اور اگر یہ زخم خوردہ اور شکستہ دل مسلمان اس مناظرہ سے سر بلند و سرخ رو ہو کر نکلتے ہیں تو یہ سیلاب بلا نہ صرف ہندوستان سے بلکہ تمام مشرقی مسلم ممالک سے رُک جائے گا۔

مولانا کیرانوی نے اللہ کا نام لے کر اس مہم کو سر کرنے کا عزم کر لیا، اور یہ طے کر لیا کہ عیسائیت کو عیسائیت کے اصلی مراجع و مآخذ سے سمجھیں گے، ان کا تجزیہ کر کے تحقیق کریں گے، ان کے اس عزم کو اور پختہ اس بات نے کر دیا کہ اس زمانہ میں ایک مشہور عیسائی پادری، عیسائیت کا مبلغ اعظم فنڈر (PFANDER) ہندوستان آیا اور علمائے دین کو للکارا، اور علانیہ مناظرہ کی

---

[1] مشترکہ غیر منقسم ہند۔

دعوت دینے لگا، اور ملک کے ہر صوبہ اور ہر ضلع میں دورے کرنے لگا، بڑے بڑے جلسے کرتا اور اس میں تقریر کرتا، اپنے مذہب کی پیروی کی دعوت دیتا تھا، حضرت کیرانوی کو ایک اور مشکل کا سامنا تھا، وہ انگریزی زبان نہیں جانتے تھے، اور دوسری زبانوں کے سیکھنے کی ایک خاص عمر ہوتی ہے اس سے وہ تجاوز کر چکے تھے، زندگی بھر ان کا مشغلہ علوم دینیہ پڑھنا پڑھانا رہا، قرآن و حدیث سے سابقہ رہا، یا علوم عقلیہ سے۔ دوسری طرف فنڈر صرف اپنی ہی زبان (انگریزی) جانتا تھا، تھوڑی بہت عربی فارسی زبان سمجھ لیتا تھا، اب ضرورت تھی کہ کوئی ایسا شخص ہوتا جو ان دونوں کے درمیان واسطہ بنتا، اور ایسے شخص کی ضرورت تھی جو دوسری یورپین زبانوں کے مراجع سے واقف ہوتا اور عیسائی وثائق کو پڑھ کر ترجمہ کر سکتا۔

اللہ کی مصلحت و حکمت نے حضرت مولانا کیرانوی کے لیے ایک ایسے شخص کو سامنے لاکر کھڑا کر دیا جس کی ضرورت تھی۔ اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وللہ جنود السمٰوٰت والارض (یعنی اللہ کے کارندے سپاہی زمین و آسمان میں پھیلے ہوئے ہیں) وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت کیرانوی کی مدد کے لیے غیب سے کھڑا کیا وہ ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی تھے، جو ۱۸۳۲ء میں لندن جاکر ڈاکٹری کی اعلیٰ سند حاصل کر چکے تھے اور انگریزی کے علاوہ یونانی زبان بھی پڑھ چکے تھے۔ انھوں نے عیسائیت کا اچھا مطالعہ کیا تھا اور اس کے مراجع خرید لیے تھے اور یہ کتابیں اپنے ساتھ ہندوستان لے آئے تھے، حضرت کیرانوی کے لیے یہ قوت بازو اور بہترین معاون ثابت ہوئے، اور وقت کا تقاضا جس جہاد کے لیے تھا اس میں وہ مولانا کے شریک و مددگار بن گئے۔

حضرت کیرانوی نے اس طرح پوری تیاری کرلی، اور معرکۂ حق و باطل کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ دوسری طرف فنڈر کی جولانیاں بھی شباب پر تھیں، ایک شتر بے مہار کی طرح پوری بے حیائی اور جرأت کے ساتھ اسلام پر ناروا حملے کر رہا تھا۔ حضرت کیرانوی نے محسوس کیا کہ سب سے پہلے اس شخص کا دہانہ توڑنا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی دوسرے عیسائی مبلغوں کو بھی سبق سکھا دیے جانے کی ضرورت ہے، اس طرح مسلمانوں کے اندر سے احساس کمتری کا ازالہ ہوگا اور ان کو اپنے دین کی حقانیت کا یقین حاصل ہوگا۔

حضرت کیرانویؒ نے محسوس فرمایا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ فنڈر سے مناظرہ کیا جائے، اور اعلانیہ جلسے میں یہ مناظرہ ہو جس میں مسلمان اور اہلِ وطن، یورپین حکام، عیسائی اور عیسائیت قبول کرنے والے ہندوستانی سب موجود ہوں، فنڈر کو اپنی کتاب 'میزان الحق' پر بڑا ناز تھا اور اکثر اسی سے وہ استدلال کرتا تھا، اور اس کو وہم تھا کہ مسلمان اور ان کے علماء ان دلائل کا رد نہیں کر سکتے۔ مولانا کیرانویؒ نے اس پادری (فنڈر) سے مناظرہ کرنے کا تہیہ کر لیا، اس سے خط و کتابت کی اور دعوت دی کہ وہ سب کے سامنے آئے، جس میں مسلمان اور غیر مسلم سب ہوں۔ جب پادری فنڈر پر بہت زور پڑا، اور اس نے دیکھ لیا کہ اب بغیر مناظرہ کیے کوئی چارۂ کار نہیں ہے تو اس دعوت کو چار و ناچار قبول ہی کر لیا، اگر اس کو اس مناظرہ کے نتائج کا اندازہ ہوتا تو شاید وہ کبھی سامنے آنا قبول نہ کرتا، بہرحال ۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء اکبرآباد (آگرہ) میں یہ مناظرہ طے پایا۔ یہ مقام عیسائیت کے فروغ کا مرکز تھا اور اس کے ایک محلہ کا نام محلہ عبدالمسیح ہی پڑ گیا تھا کیوں کہ وہاں عیسائیت قبول کرنے والے ہندوستانی کافی تعداد میں تھے۔

متعینہ تاریخ میں جلسہ شروع ہوا۔ ضلع کے حکام، عدالت کے جج، اور انگریزی چھاؤنی کے بہت سے عہدہ دار موجود تھے، پادری فنڈر اور پادری ولیم کلین (WILLIAM CLEAN) اور شہر کے اعیان و سربرآوردہ اشخاص ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ہی موجود تھے۔ ڈاکٹر محمد وزیر خاں حضرت کیرانویؒ کے مترجم و معاون کی حیثیت سے شریک تھے، مناظرہ کے پانچ موضوع تھے۔

۱۔ بائبل عہد قدیم (اولڈ ٹیسٹامنٹ) اور عہد جدید (نیو ٹیسٹامنٹ) میں تحریف ہوئی۔
۲۔ بائبل میں کچھ احکام منسوخ قرار دیے گئے۔
۳۔ عقیدۂ تثلیث۔
۴۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت۔
۵۔ قرآن کی صداقت و صحت۔

اس مناظرہ میں شرط یہ تھی کہ اگر مولانا کیرانویؒ نے اس مناظرہ میں بازی جیت لی تو

فنڈر اسلام قبول کرے گا، اور اگر اس کے برعکس ہوا تو مولانا کیرانویؒ عیسائیت کو تسلیم کرلیں گے۔ اس شرط کی وجہ سے اس مناظرہ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ پہلے روز کا مناظرہ ختم ہوا تو ہر جگہ اس کا چرچا ہونے لگا، ہر مجلس میں یہی موضوع تھا جس پر تبصرے ہو رہے تھے، کیوں مناظرہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ پادری فنڈر نے یہ اعتراف کرلیا کہ آٹھ مقامات میں بائبل کے اندر تحریف موجود ہے۔

دوسرے روز جلسۂ عام میں عیسائی، سکھ، ہندو، اور مسلمانوں کی بڑی تعداد مناظرہ میں شریک ہونے کے لیے آئی۔ فنڈر نے کہا کہ انجیل میں جو غلطیاں ہیں وہ کتابت کی غلطیاں ہیں، لیکن وہ عبارتیں جن میں عقیدۂ تثلیث، حضرت عیسیٰ کی الوہیت، فدار اور شفاعت کا ذکر ہے وہ تحریف سے محفوظ ہیں۔ پادری فنڈر کے ترکش کا یہ آخری تیر تھا جس کو اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ استعمال کیا۔ حضرت کیرانویؒ نے جواب دیا:

"جب تم انجیل میں تحریف کو تسلیم کرتے ہو۔ تو پوری کتاب مشکوک ہوگئی"۔

اس پر بحث ختم ہوئی اور پادری فنڈر تیسرے روز مناظرہ کے لیے آیا ہی نہیں۔ اس کے بھاگ کھڑے ہونے سے واضح ہوگیا کہ وہ مناظرہ کے میدان میں شکست کھا گیا اور مسلمانوں کی یہ بڑی کامیابی تھی جس سے ایمانی قوت میں اضافہ ہوا، اور پادریوں کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت عام مسلمانوں نے اپنے اندر محسوس کی۔ عیسائیت کے عقلی و علمی دبدبہ اور بلند بانگ دعووں اور اسلام پر تہمتوں کی حقیقت سب کے سمجھ آگئی۔

اس مناظرہ کے دو سال بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا واقعہ پیش آیا جو ایک طرح سے مسلمانوں کی آخری کوشش تھی کہ انگریزوں کے بچھائے ہوئے جال سے نکل آئیں، لیکن اس جنگ میں مسلمان ناکام رہے، اور ان کی ناکامی کے بعد انگریز غضبناک، طاقت ور اور انتقام کے جذبے سے بھرے ہوئے دشمن کی طرح پیش آئے، اور وہ جانتے تھے کہ اس جنگ کی قیادت مسلمان کر رہے تھے اور انہی کا یہ پلان تھا اور وہی اس کی ہمت کرسکتے تھے، اور دوسرے ہم وطن ان کے ساتھ ہو لیے تھے، اس لیے مسلمانوں کے علماء ان کے جذبۂ انتقام اور غصہ کا سب سے زیادہ شکار رہے، اور آئندہ بھی انگریز کو خطرہ انہی مسلمانوں اور ان کے

علماء سے تھا، عوام میں انہی کی مقبولیت تھی لہذا انگریزوں نے ایک ایک عالم کو پکڑ پکڑ کر قتل کرنا شروع کیا، ان کو پھانسی دیتے، سولی پر چڑھاتے، ان کی گردنیں درختوں سے لٹکاتے اور طرح طرح کی تذلیل واہانت کا سلوک کرتے، اور تلاش کرکے ایسے افراد کو ڈھونڈتے جن کی مسلمانوں کے درمیان عزت وتوقیر ہوتی، اور لوگ جن کی بات سنتے۔ انگریزوں کو جن افراد کی تلاش تھی ان میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ صف اول کے لوگوں میں تھے، کیوں کہ مذہبی مناظرہ میں وہ ان کو شکست دے چکے تھے اور ان کے خلاف جو جہاد کیا گیا اس میں شریک تھے۔ مصلحت وقت کا تقاضا تھا کہ مولانا کچھ عرصہ کے لیے ایک گاؤں میں روپوش ہو جائیں، جب انگریز ان کی تلاش میں اس گاؤں میں بھی پہنچ گئے، تو مولانا نے کلہاڑی لے کر کسانوں کے بھیس میں کھیت میں کٹائی کا کام شروع کر دیا، اور اس طرح اللہ نے ان کو بچایا اور انھوں نے کسی طرح سورت کی بندرگاہ سے روانہ ہو کر بلاد مقدسہ کی طرف ہجرت کر لی، یہ ۱۸۶۲ء کا واقعہ ہے یعنی جنگِ آزادی کے پانچ سال بعد، ان کی جائدادیں سب کی سب ضبط کر لی گئیں جو خاصی بڑی تھیں، اور ان کو نیلام کر دیا گیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مسلمانوں کے خلیفہ سلطان عبدالعزیز عثمانی تھے، اور مکہ مکرمہ میں ان کے گورنر شریف عبداللہ بن عون تھے، جب ان کی علمی منزلت کا پتہ چلا تو حرم شریف میں ان کو درس دینے کی اجازت مل گئی، اور اس وقت کے سربرآوردہ علماء سے ان کے تعلقات ہوئے جن میں مکہ مکرمہ کے سب سے بڑے عالم شیخ احمد زینی دحلانؒ تھے جو مولانا کیرانوی کے خاص احباب میں تھے اور انھوں نے ہی مولانا کیرانوی کو شریف مکہ سے ملایا اور علمائے مکہ سے ان کا تعارف کرایا۔

ایک اتفاقی بات پیش آئی کہ پادری فنڈر ایک عرصہ تک یوروپ کے مختلف ملکوں جرمنی، سوئزرلینڈ، انگلینڈ میں رہا اس کے بعد اس کو لندن کی تبلیغی انجمن (مشنری) نے قسطنطنیہ بھیجا کہ مسلمانوں کے مرکزی مقام، خلافت کے پایۂ تخت میں جا کر عیسائی تبلیغ کی مہم چلائے۔ اس نے سلطان عبدالعزیز سے ملاقات کی اور ہندوستان کے اس مناظرہ کا قصہ بیان کیا اور کہا کہ عیسائیت کو اسلام پر فتح حاصل ہو گئی، سلطان عبدالعزیز

خلیفۃ المسلمین تھے ان کو اس بیان سے سخت حیرت ہوئی، انھوں نے شریف مکہ کو لکھا کہ ہندوستان سے آنے والے حاجیوں سے معلوم کریں کہ اصل واقعہ کیا ہے اور کس طرح پیش آیا؟ اور اس مناظرہ اور انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی بغاوت (۱۸۵۷ء) کی صحیح نوعیت سے مطلع کریں۔ شریف مکہ شیخ العلماء سید احمد دحلان سے پورا واقعہ معلوم ہو چکا تھا، انھوں نے دار الخلافہ کو مطلع کیا کہ اصل واقعہ کیا ہے اور یہ کہ اس مناظرہ کے "بطل" (ہیرو) جو عالم دین ہیں وہ حسن اتفاق سے مکہ مکرمہ میں موجود ہیں، سلطان عبد العزیز نے حضرت مولانا کیرانوی کو دار الخلافہ آنے کی دعوت دی، چنانچہ مولانا وہاں (۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں) تشریف لے گئے۔ جب پادری فنڈر کو معلوم ہوا کہ شیخ (مولانا کیرانوی) قسطنطنیہ آرہے ہیں اسی وقت وہاں سے فرار ہو گیا۔ سلطان عبد العزیز نے وہاں کے علماء کو جمع کیا، جس میں وزراء اور اعیان ملک شریک تھے، مولانا کیرانوی سے اس مناظرہ کا حال سنا کہ کس طرح اسلام کو انھوں نے عیسائیت پر فتح یاب کیا، پھر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی داستان سنی، سلطان نے اسی وقت عیسائی مبلغوں پر پابندی لگا دی اور اس سلسلہ میں سخت قوانین نافذ کیے۔ سلطان اکثر و بیشتر نماز عشاء کے بعد مولانا کیرانوی سے ملا کرتا اور آپ کے نصائح و ارشادات سنا کرتا۔ اس مجلس میں حکومت کے صدر اعظم خیر الدین پاشا تیونسی بھی شریک رہتے، وہاں کے شیخ الاسلام اور بڑے سر برآوردہ علماء بھی اس مجلس میں آیا کرتے تھے۔

مولانا سے جب صدر اعظم اور خلیفہ عبد العزیز نے مناظرہ کا قصہ سنا اور ان کی علمی عظمت، وسعت مطالعہ اور مسیحیت پر ان کی ناقدانہ بصیرت کا اندازہ کیا تو یہ درخواست کی کہ وہ عربی زبان میں ایک مبسوط کتاب لکھ دیں جس میں ان پانچوں عناوین پر سیر حاصل بحث ہو جو مناظرہ کے لیے موضوع بحث قرار پائے تھے۔ مولانا نے اس تجویز کو قبول فرمایا، اور "اظہار الحق" کی تالیف وہیں قسطنطنیہ میں شروع کر دی۔ رجب ۱۲۸۰ھ میں یہ تالیف شروع کی اور ذی الحجہ میں مکمل کر لی، یعنی صرف چھ ماہ میں یہ ضخیم دستاویز تیار ہو گئی، سلطان کی خدمت میں یہ ہدیہ پیش کیا اور مقدمہ میں تحریر فرمایا کہ یہ کتاب شیخ العلماء علامہ زینی دحلان کی تجویز پر لکھی ہے۔ صدر اعظم خیر الدین پاشا نے مولانا سے عرض کیا کہ آپ نے تو یہ کام امیر المومنین کی فرمائش پر کیا ہے، مناسب یہ تھا کہ امیر المومنین کا نام آپ لکھتے، خلیفۃ المسلمین کا اکرام اور حق و انصاف سے قریب تر بات یہی ہے۔ مولانا نے فرمایا

یہ خدمت صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے میں نے انجام دی ہے اس میں کوئی دنیاوی غرض شامل نہیں ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ شیخ العلماء دحلان نے مجھ سے پہلے اس کی فرمائش کی تھی اور کہا تھا کہ اس مناظرہ کی روداد قلم بند کروں، اور مکہ مکرمہ میں میں نے اس کتاب کے مواد جمع کرنا شروع کر دیے تھے، اور شیخ دحلان ہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے مجھے شریف مکہ سے متعارف کرایا اور آج دربار خلافت تک میری رسائی کا سبب وہی ہیں، لہذا ان کے فضل وکرم کا اعتراف ضروری ہے

اس طرح یہ کتاب معرض وجود میں آئی، اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے دفاعی موقف کے بجائے حملہ آور ہونے کا موقف کیا ہے، اور یہ موقف بہت ہی کار آمد ہوتا ہے کہ حریف کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دیا جائے، اور اس کو مجبور کیا جائے کہ وہ ملزم کے کٹہرے میں کھڑا ہو، اور وہ اپنی صفائی پیش کرے، پہلے علماء نے اس بات کو محسوس نہیں کیا تھا اور تورات وانجیل اور قرآن کو ہم پلہ سمجھ کر گفتگو کرتے تھے، اس طرح ان قدیم صحیفوں کو وہ اہمیت حاصل ہو جاتی جس کے حقیقتاً وہ مستحق نہ تھے، حالاں کہ خود حاملین تورات وانجیل یہ تسلیم نہیں کرتے کہ قرآن کی طرح بغیر کسی تغیر وتبدل کے آسمانی صحیفوں کا امتیاز ان میں پایا جاتا ہے۔

شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بہت مناسب قدم اٹھایا تھا کہ اپنی کتاب "الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح" میں جارحانہ موقف اختیار کیا تھا، کیوں کہ اہل تحقیق علماء کے نزدیک تورات وانجیل کی حیثیت دوسرے تیسرے درجہ کی احادیث وسیرت کی کتابوں سے زیادہ نہیں ہے، اور نہ ان صحیفوں کی ثابت شدہ سند ہے۔ ان صحیفوں کو حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد مختلف مرحلوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ ان میں کچھ حضرت مسیح کے اقوال ہیں اور کچھ ان کے معجزات کا بیان ہے اور کچھ ان کے اخلاق واعمال کا ذکر ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے بہت گہرائی کے ساتھ ان صحیفوں کا مطالعہ کیا تھا اور اس کی تہ کو پہنچ گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے انداز گفتگو سے مناظرہ کی نوعیت بدل گئی اور حریفوں کو جو پہلے بالادستی ہو جایا کرتی تھی وہ ختم ہو گئی۔

۲۔ اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ مولانا کیرانویؒ نے زیادہ جزئیات سے بحث نہیں کی ہے، کیوں کہ اس میں بحث ومناظرہ اور چوں چرا کی گنجائش رہتی ہے۔ مولانا نے صاف نظر آنے والی اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی باتیں ذکر کی ہیں، جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے بائبل میں ایک دوسرے سے متضاد باتوں کو نکال دکھایا ہے کہ کوئی الہامی کتاب جس میں تحریف نہیں ہوئی ہو، اس طرح متضاد باتوں کا مجموعہ نہیں ہو سکتی، اس طرح کی ایک سو آٹھ کھلی ہوئی غلطیوں کو انھوں نے دکھایا ہے۔ یہ باتیں ایسی ہیں جیسے ریاضی کے فارمولے ہوتے ہیں، دو اور دو چار کی طرح جس کے نتائج سب کے سامنے ہیں اور دوسرے کھلی ہوئی تحریف کے نمونے ہیں جہاں الفاظ کے اضافے ہیں، کہیں کمی ہے، کہیں تشریحی جملے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب ایک آسمانی صحیفہ کا درجہ حاصل ہی نہیں کر سکتی۔

۳۔ عیسائیوں نے انجیل کو وحی منزل ثابت کرنے کے لیے جو عبارت آرائی کی ہے اور مغالطے میں ڈالنے کی کوششیں کی ہیں ان کو نقل کرنے کے بعد انتہائی آسان اور قابلِ قبول اسلوب بیان میں ان کا رد کیا ہے۔

۴۔ حضرت کیرانویؒ نے عقیدۂ تثلیث کو عقل کی کسوٹی پر رکھ کر اور اس کا علمی تجزیہ کر کے دکھایا ہے کہ کوئی بھی صاحب عقل و ذوق اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

۵۔ حضرت کیرانویؒ نے صرف یہی نہیں کیا کہ عیسائیت کے عقائد اور ان کے صحیفوں کی حقیقت کھول کر دکھا دی بلکہ قرآن کریم پر جو ان کے اعتراضات رہے ہیں اس کا بھی تشفی بخش جواب دیا اور دکھایا کہ قرآن کریم کے کتاب اللہ ہونے میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے، اس سلسلہ میں عیسائیوں کے پیدا کردہ شبہات کا جواب دیا اور اسی سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ، معجزات کو بیان کیا اور آپؐ کے حق میں انبیائے سابقین نے جو بشارتیں دی ہیں ان میں سے اٹھارہ بشارتوں کا ذکر کیا۔

ان اسباب کی بنا پر کتاب کی اہمیت بڑھ گئی اور ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لی جانے لگی، ایک ترکی عالم نے اس کا ترجمہ کیا اور اس کا نام 'ابراز الحق' رکھا۔ ایک صاحبِ قلم نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا جو ہند و پاکستان کے کتب خانوں میں موجود ہے۔

مولوی غلام محمد راندھیری نے اس کا گجراتی زبان میں ترجمہ کیا تھا، اردو میں مولانا اکبر علی سہارنپوری مرحوم نے تین جلدوں میں اس کا ترجمہ کیا تھا، جس کا نام "بائبل سے قرآن تک" ہے اس پر مولانا تقی عثمانی نے مفصل مقدمہ لکھا ہے وہ فاضلانہ اور محققانہ ہے اور اس لائق ہے کہ علیحدہ سے شائع ہو۔

عیسائیوں کے پادریوں کا یہ معمول رہا کہ جہاں یہ کتاب بازار میں آئی اس کے تمام نسخے خرید کر جلا دیے تاکہ لوگ پڑھ نہ سکیں، اس لیے بار بار اس کی طباعت ہوتی رہی، مراکش کی وزارت اوقاف و امور مذہبی نے اس کو بہت آب و تاب سے شائع کیا ہے۔

شیخ عبدالرحمن بک باجہ جی زادہ نے اپنی کتاب 'الفارق بین الخالق والمخلوق' میں اس کتاب کا بلند الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ علامہ رشید رضا نے 'انجیل برناباس' کے عربی ترجمہ کے مقدمہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

عیسائیوں کے حلقے میں اس کتاب کے بارے میں کیا تاثر ہے وہ صرف ایک جملہ سے واضح ہو جاتا ہے، جو برطانیہ کے ایک اہم اخبار نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"اگر لوگ اس کتاب کو پڑھتے رہے تو دنیا میں عیسائیت کو کبھی فروغ نہیں ہو سکتا۔"

(عربی سے ترجمہ: ع‌ عن)

مولانا حکیم محمد یامین صاحب کی رحلت

مکہ مکرمہ کی ایک اطلاع سے معلوم ہوا کہ بروز جمعہ ۱۱ اگست کو حکیم محمد یامین صاحب علیہ الرحمہ کی وفات ہوئی اور جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے، مولانا کی عمر اسّی کے قریب ہوگئی، ان مخصوص بندگان خدا میں تھے جن کا قیام سرزمین حرم میں اس طرح رہا کہ انھوں نے صرف دین کو اپنا مطمح نظر رکھا۔ بیت اللہ کے سوا کسی اور بیت کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا علیہ الرحمۃ نے ان کو اپنی خلافت دی تھی، بہت ہی متقی، مرتاض، خاموش و ملنسار، زاہد و متواضع بزرگ تھے، ناظرین ان کے لیے دعائے مغفرت کو اپنی سعادت سمجھیں۔

(ع‌ عن)

مجاہدِ اعظم
حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی

گذشتہ صدی کا ماہ رجب ۱۲۸۰ھ مسلمانانِ ہند و پاکستان کی مذہبی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے جس میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے مغربی قوت و اقتدار اور عیسائیت کے غلبۂ تسلط کے باوجود عظیم الشان فتح و نصرت عطا فرمائی۔

زمانہ بدل چکا، خیالات و رجحانات میں غیر معمولی انقلاب رونما ہے۔ سیاسی پیچیدگیاں اور ہنگامہ آرائی، معاشی مشکلات، باہمی تفریق و اختلاف کے اس دَور میں یہ فرسودہ بیانی بظاہر بے وقت کی راگنی ہے۔ دماغی بے اعتدالی اور برق رفتاری کے ساتھ دنیا ایک نامعلوم سمت کی طرف جا رہی ہے، اس بھاگ دوڑ میں کسے فرصت ہے کہ وہ مڑ کر پیچھے دیکھے اور موجودہ نسل کسی ذکرِ کہن کو سننے کے لیے تیار ہو ـــ مگر تاریخ کا نام جب تک دنیا میں زندہ ہے اور زندہ قومیں اپنی مذہبی اور قومی تاریخ اور شاندار کارناموں کو جب تک اپنا سرمایۂ حیات سمجھتی رہیں گی اس وقت تک ہر پرانی یاد اور پرانا تذکرہ، گزرے ہوئے حالات اور واقعات منصۂ ظہور پر کسی نہ کسی عنوان سے ضرور آتے رہیں گے۔

دنیا گہوارۂ انقلاب ہے۔ ہندوستان قدیم میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ہمدوش مذہب عیسوی نے بھی فروغ حاصل کیا اور ہر ممکن صورت سے اس مغلوب ملک کو مذہبی حیثیت سے بھی فتح کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ کمپنی کی تائید و اعانت سے مذہب مسیحی کی تنظیم اور ترقی عمل میں آتی رہی۔ ملک کے طول و عرض میں ہر جگہ اس تنظیم کے آثار قائم کیے گئے۔ چرچ، مشن سوسائٹی، بائبل سوسائٹی، مشن فنڈ، مشن اسپتال، مشن کالج اور مدارس جابجا قائم ہوئے۔ مذہبی کتابوں اور اخبارات و رسائل کی اشاعت کے ذریعہ عوام کے رجحانات و عقائد

کو بدلنے کی مہم جاری کی گئی۔ یہ صرف مذہبی جد و جہد نہ تھی بلکہ خود حکومت (کمپنی) کی ملکی سیاست اور عملی تائید بھی شریک تھی۔ مشنریوں کو مالی امداد دی جاتی تھی اور ممتاز حکام ان کی ہر ممکن سرپرستی کو اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے حکامِ وقت کا اثر و رسوخ کوئی معمولی چیز نہیں۔ اس لیے مسیحی تحریک کو یہاں تک تقویت پہنچ چکی تھی کہ جب دہلی میں ۱۸۵۲ء میں "عہدۂ بشپ" قائم کرنے کا سوال پیش ہوا تو اس وقت یہ تجویز بھی مد نظر تھی کہ جامع مسجد دہلی کو گرجا بنا دیا جائے۔ اس صورتِ حال کا ناگزیر اثر تھا کہ ہند قدیم میں خاص طور پر مسلمانوں کو انگریزی حکومت سے تنفر پیدا ہوا اور مسیحیت کی اشاعت میں قوت و سیاسی اقتدارِ اعلیٰ سے کام لینے کی بنا پر مذہبی مدافعت کی اہم ضرورت پیش آئی۔ اسلام کی صداقت و حقانیت کے خلاف جو سازش کی جا رہی تھی اس پر ربانی علماء کب صبر و سکوت کر سکتے تھے۔ اس دور کے وہ مجاہد علماء جنھوں نے جرأت و ہمت سے کام لے کر ہندوستان قدیم کے مسلمانوں کو فتنۂ مسیحیت کی مصیبت اور بلا سے نجات دلائی، ان کے متعلق مولانا حالی مرحوم فرماتے ہیں:

> "ہندوستان میں اسلام خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری گھات میں لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ قحط کے دوران میں ان کو دُبلا پتلا شکار پیٹ بھرا مل جاتا تھا مگر وہ اس پر قانع نہ تھے اور ہمیشہ صید فربہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ دانت اُن کا مسلمانوں پر تھا اس لیے ان کی منادیوں میں، ان کے اخباروں میں، ان کے رسالوں میں زیادہ تر بوچھار اسلام پر ہوتی تھی۔ اسلام کی تعلیم کی طرح طرح سے بُرائیاں ظاہر کرتے تھے۔ بانیٔ اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع و اقسام کی نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب اور اکثر افلاس کے سبب ان کے دام میں آگئے۔ اس خطرہ سے بلاشبہ علمائے اسلام جیسے مولانا آل حسن، مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم اور ڈاکٹر وزیر خاں وغیرہ متنبہ ہوئے۔ انھوں نے متعدد کتابیں عیسائیوں کے مقابلے میں لکھیں اور ان سے بالمشافہ مناظرہ کیے جس سے یقیناً مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا رد نصاریٰ میں تالیف و تصنیف اور پادریوں سے مقابلہ و مناظرہ کا سلسلہ ایک جماعتی نہ سہی لیکن انتظامی شکل میں شروع ہو گیا تھا۔ قدرتی طور پر ہر جگہ مسجدیں تھیں۔ علمائے کرام

کے وہ گرمد تھے۔ اس انقلابی تحریک کے چلنے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی، رہنما کی ضرورت تھی۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے بہتر کون ثابت ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اس کی بنیاد ڈالی اور اس کام کے لیے دہلی، آگرہ کو مرکز قرار دیا۔ یہاں بھی مولانا نے تصنیف وتالیف کا کام کیا۔ ان کی جماعت میں ہندوستان کے انتہا پسند اور حضرت اسماعیل شہیدؒ کے فدائی مسلمان تھے جن کی تعداد کافی تھی۔"

اس تحریک کا ذکر پادری فنڈر اس طرح تعلّی کے ساتھ کرتا ہے:

"یہاں (آگرہ) کے علمائے اسلام دہلی کے علماء کے ساتھ مل کر گزشتہ دو تین سال سے کتاب مقدس کا اور ہماری کتابوں اور مغربی علماء کی تنقیدی کتب اور تفاسیر کا مطالعہ کر رہے تھے تاکہ وہ کتابِ مقدس کو غلط اور باطل کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کے عالم مولوی رحمت اللہ (کیرانوی) نے دو کتابیں تصنیف کیں۔ جنوری ۱۸۵۴ء میں جب میں یہاں نہیں تھا وہ آگرہ آیا تھا کہ اپنے احباب کے ساتھ ان کتب کو چھپوانے کا انتظام کرے۔ مباحثہ ہوا، تقریباً ایک سو مسلمان علماء مولوی رحمت اللہ کی مدد کے لیے جمع تھے، اور دوسرے روز اس کی دوگنی تعداد تھی۔"

یہ علماء بلا کسی معاوضہ کے رد نصاریٰ میں اپنا وقت صرف کرتے رہے، اور ہر صوبہ اور ہر ضلع میں ان کے شاگرد رد نصاریٰ کا فرض ادا کرتے تھے۔ اگر کوئی خاص معاملہ یا مناظرہ ہوتا تھا تو مرکز سے علمائے کرام ان کا مقابلہ کرنے کے لیے جاتے جس سے پادریوں اور عوام پر خاطر خواہ اثر ہوتا تھا، جو ان کی رپورٹوں میں موجود ہے۔ اگرچہ وہ مخالفانہ و معاندانہ انداز میں ہے، لیکن واقعات کے ڈھنگ اور عیسائیوں کے طرز سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علمائے کرام ہر ضلع میں ان کے مدمقابل تھے اور ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ چنانچہ "پادری فرنچ، انچارج ضلع ملتان" کی رپورٹ میں ہے:

"ملتان کے مُلّا سید اور مخدوم سب اس بات کے لیے کوشش کر رہے تھے کہ خدا کی روشنی کو داخل نہ ہونے دیں۔ یہ دو مشہور شخصوں یعنی مولوی رحمۃ اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں کے جنھوں نے اسلام کا طرفدار ہو کر ڈاکٹر فنڈر سے مباحثہ کیا تھا،

دوست تھے۔"

حیاتِ شبلی کے دیباچہ میں علامہ سید سلیمان ندوی صاحب لکھتے ہیں:

"انگریزوں کے برسرِ عروج آتے ہی تین طرف سے حملوں کا آغاز ہوا۔ عیسائی مشنریوں نے اپنی نئی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے تلواروں پر حملے شروع کر دیے۔ دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق مسلمان حکمرانوں سے نجات پاکر ان پر حملہ کی جرأت پائی اور سب سے آخر میں یورپین علوم وفنون اور تمدن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی۔ خدا نے عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب (آگرہ) اور اس کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولانا رحم علی صاحب منگوری، مولانا عنایت رسول صاحب چریا کوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری، وغیرہ اشخاص پیدا کیے جنھوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑا دیے۔ اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا وجود تو ردِ عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں۔ اور کون باور کر سکتا تھا کہ اس وقت میں پادری فنڈر کے مقابلہ کے لیے ڈاکٹر وزیر خاں جیسا آدمی پیدا ہوگا جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل، اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود انہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابلِ شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کر دے گا۔

آریوں کے دیانند سرسوتی کے مقابلہ کے لیے خاص طور پر مولانا محمد قاسم صاحب کا ظہور بھی تائید غیبی ہی کا نشان ہے، اور پھر جس طرح عقائد حقہ کی اشاعت اور رد بدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور اس جماعت کے دیگر مقدس افراد کے ذریعہ انجام پایا اس کے آثار باقیہ اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔"

۱۲۷۰ھ ہجری کے ماہِ رجب میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور پادری فنڈر کے درمیان آگرہ میں یادگار زمانہ مناظرہ منعقد ہوا، جس میں حق کو فتح وکامیابی اور باطل کو ہزیمت وشکست ہوئی۔ یہ حالات آئندہ سطور میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے، بالعموم حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کو پاکستان و ہند کی موجودہ دنیا "بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ" کی حیثیت سے جانتی ہے مگر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مجاہدانہ کارناموں اور مدافعتِ اسلام کی عظیم الشان خدمت سے واقف نہیں۔ باخبر خواص یقیناً واقفِ حال ہیں اسلام کی اس قابلِ فخر نصرت وکامیابی کے صد سالہ یادگاری ذکرِ خیر کے ساتھ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کے مختصر حالاتِ زندگی ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ محلہ دربار کلاں، قصبہ کیرانہ، ضلع مظفر نگر میں ماہ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۳ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ بعض قلمی یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ کیرانہ قدیم زمانہ میں چوہان راجپوتوں کی راجدھانی رہ چکا ہے۔ جونڈلہ اور بانسہ ضلع کرنال میں جو چوہان آباد تھے ان کے مورثِ اعلیٰ رانا ہترہ کی اولاد میں سے رانا کلسہ کیرانہ کا حکمراں تھا۔ جس کی وجہ سے قصبہ اور نواح کے چوراسی گاؤں "کلسیان گوجر" کہلاتے ہیں، رانا کلسہ چوہان راجپوت تھا مگر کیرانہ اور اس کے نواح میں گوجر قوم آباد تھی اس لیے رانا نے اسی قوم میں شادی کی۔ رانا کلسہ سلطان محمود غزنوی کا معاصر تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں سلطان کی اجازت سے سید سالار مسعود غازیؒ مجاہدین کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور جھنجانہ ہو کر کیرانہ پر حملہ کیا۔ شہر کے شمالی اور غربی نواح میں آج تک مزار شہداء موجود ہیں۔ ایک قبر چند گز طویل شہر کے شمالی جانب میں ہے جو عرب شہداء کی قبر بتائی جاتی ہے۔ اس میں بہت سے شہداء کو ایک جگہ دفن کر دیا گیا ہے۔ سید سالار مسعود غازیؒ کے کیرانہ پر حملہ کی یادگار آج تک سالاری قوم قصبہ میں موجود ہے۔ یہ عرب نژاد قوم قصبہ میں شتربانی کا کام کرتی ہے اور اونٹ ان کا ذریعۂ معاش ہیں۔ کیرانہ میں سب سے پہلے یہی سالاری قوم آباد ہوئی۔ سلاطین تغلق کے زمانہ میں شیخ علاء الدین انصاری اس نواح کے منصبِ قضا پر مقرر ہوئے۔ اس وقت سے

انصار کیرانہ میں آباد ہیں۔ شیر شاہ کے زمانہ میں "کاکڑ زئی" افغان آباد ہوئے جن کی اولاد اب تک موجود ہے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کا نسب نامہ :

رحمت اللہ بن خلیل اللہ المعروف بہ خلیل الرحمٰن بن حکیم نجیب اللہ بن حکیم حبیب اللہ بن حکیم عبدالرحیم بن حکیم قطب الدین بن شیخ حکیم فضیل بن حکیم دیوان عبدالرحیم (برادر نواب مقرب خاں) بن حکیم عبدالکریم المعروف بہ حکیم بینا المقلب بہ "شیخ الزماں" بن حکیم حسن بن عبدالصمد بن ابو علی بن محمد یوسف بن عبدالقادر بن کبیرالاولیا مخدوم جلال الدین محمدؒ بن محمود بن یعقوب بن عیسیٰ بن اسماعیل بن محمد تقی بن ابی بکر بن علی نقی بن عثمان بن عبداللہ بن شہاب الدین بن شیخ عبدالرحمٰن گاذرونی بن عبدالعزیز سرخسی بن خالد بن ولید بن عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن کبیر مدنی بن عبداللہ الثانی بن عبدالعزیز کبیر بن عبداللہ کبیر بن عمرو بن امیرالمومنین ذوالنورین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔

ہندوستان میں عثمانیوں کا نسب نامہ نسلاً بعد نسلٍ اس قدیم تاریخی طومار میں محفوظ ہے جو حضرت کبیرالاولیا مخدوم جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ پانی پت میں موجود ہے اور جس کی متعدد نقول بعض عثمانی النسب اہل پانی پت کے پاس ہیں۔ اصلی طومار میں ہر عثمانی جلالی کے نام کا اندراج کم از کم بیس جلالی النسب اشخاص کی موجودگی میں ہوتا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ آں قدح بشکست۔

حضرت مخدوم کبیرالاولیا رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ شرف الدین بو علی قلندرؒ سے ہمیشہ استدعائے بیعت کیا کرتے تھے اور قلندر صاحب ہمیشہ یہ جواب دیتے کہ "تمہارا مرشد آنے والا ہے ابھی صبر کرو، ہم بتادیں گے۔" جب حضرت خواجہ شمس الدین صاحب ترک رحمۃ اللہ علیہ وارد پانی پت ہوئے تو قلندر صاحب نے مخدوم صاحب سے فرمایا کہ جاؤ تمہارے پیر آتے ہیں اُن کا استقبال کرو۔ آپ گھوڑے پر سوار شہر سے باہر نکلے دیکھا کہ ایک فقیر چلے آتے ہیں۔ بسلام کے بعد خواجہ صاحب نے فرمایا کہ "میاں جوان! ذرا اپنے

گھوڑے کی چال تو دکھاؤ۔" آپ نے باگ اٹھائی اور گھوڑے کو دوڑایا۔ خواجہ صاحب بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ "زہے اسپ و زہے سوار"۔ مخدوم صاحب پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی اور آپ گھوڑے پر سے گرے۔ خواجہ صاحب نے سینے سے لگایا اور جو کچھ دینا تھا دیا اور بیعت کر کے خلافت عطا فرمائی۔ حضرت مخدوم صاحبؒ کو مطالعہ قلندر صاحبؒ کرا چکے تھے لیکن تعلیم خواجہ شمس الدین صاحب ترک پانی پتیؒ پر منحصر و موقوف تھی جو پایۂ تکمیل کو پہنچی، مخدوم صاحب کا وصال پانی پت میں ۱۲ ربیع الاول ۷۶۵ھ ہجری کو ہوا۔ پانی پت میں محلہ مخدوم زادگان میں آپ کی اولاد موجود اور آباد تھی جو انقلاب ۱۹۴۷ء میں منتشر ہو گئی مگر درگاہ مخدوم صاحب اور مسجد وغیرہ باقی ہے۔

ہندوستان میں عثمانیوں کی آمد:

سلطان محمود غزنوی (وفات ۲۳ ربیع الاول ۴۲۱ھ مطابق ۲۹ اپریل ۱۰۳۰ء) کا جس ماحول میں نشو و نما ہوا اس کا اثر ہے کہ وہ ابتداسے اہلِ علم اور اربابِ کمال کا دلدادہ تھا۔ اس کی زندگی پر اس واقعہ کا بہت گہرا اثر ہے کہ اس نے اپنے خوشنما باغ میں ایک دلکش مکان تعمیر کیا جس کے جشن میں اس نے دوسرے امراء اور اعیانِ مملکت کے ساتھ اپنے باپ امیر سبکتگین کو بھی مدعو کیا۔ باپ نے باغ اور مکان کے دل فریب ماحول کو بے حد پسند کرتے ہوئے اپنے ہونہار لائق ولی عہد کو جو قیمتی نصیحت کی وہ یہ تھی:

> "ایسے باغ اور مکان تو دوسرے امیر بھی بنوا سکتے ہیں تم کو وہ عمارت تعمیر کرنی چاہیے کہ جس کی برابری کوئی دوسرا نہ کر سکے۔" محمود نے پوچھا: "ایسی عمارت کون سی ہے؟" باپ نے جواب دیا کہ "وہ اہلِ علم و فضل کے دلوں کی تعمیر ہے جو کوئی نہالِ احسان ان کی زمینِ دل میں لگائے اس کا ثمرہ پائے۔"

اس قسم کی مشفقانہ نصائح و ہدایات اور اس زمانہ کے قدرشناس ماحول میں مذہبی اور دینی تربیت کا نتیجہ تھا کہ سلطان محمود غزنوی علماء اور اہلِ کمال کا ہمیشہ قدردان رہا۔ اس کو علوم و فنون سے طبعی لگاؤ تھا، ہر کام میں کفایت شعاری مدنظر رہتی مگر ہنر پروری

میں اس کا فیض عام تھا۔ علماء کے لیے وظائف اور تنخواہیں مقرر تھیں۔ دارالعلوم، کتب خانے، عجائب خانے وغیرہ اس کی علم نوازی کا ثبوت تھے۔ اس کے دربار میں علماء، ادباء اور شعراء جمع رہتے۔ عصائری، رازی، اسدی، طوسی، منوچہری، حکیم عنصری، عمجدی، فرخی، عتبی، علامہ ابوریحان جیسے یگانۂ عصر شعراء اور علماء اس کے عہد میں پائے گئے۔

یہی پہلا مسلمان حکمراں ہے جو سلطان کے لقب سے موسوم ہوا۔ سلطان محمود غزنوی کی دین پروری اور علماء نوازی سے سلطنت کے اکثر و بیشتر عہدوں پر قابل اور لائق دینی حکام مقرر تھے۔ فوج کی تنظیم کا بھی خاص اہتمام تھا۔ فوجی عہدوں میں بھی علماء کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے جد اعلیٰ شیخ عبدالرحمٰن گازرونی سلطان محمود غزنوی کی فوج میں شرعی حاکم تھے۔ یہ عہدہ "قاضی عسکر" کے نام سے خلفائے آل عثمان رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں بھی ہمیشہ رہا اور آخری خلیفہ سلطان محمد رشاد خاں خامس کے زمانہ تک اس عہدہ پر ممتاز اور متدین علماء مقرر کیے جاتے تھے جو فوج کے تمام شرعی معاملات و مقدمات کا فیصلہ کیا کرتے۔ شیخ عبدالرحمٰن گازرونی (گازرون ایران کے توابعات شیراز میں مشہور مقام تھا) سلطان محمود غزنوی کے لشکر کے ساتھ "قاضی عسکر" کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور جب سلطان محمود غزنوی نے سومنات کے مندر پر حملہ کیا تو یہ فوج کے ساتھ شریک جہاد تھے۔ فتح پانی پت کے بعد یہیں مقیم ہوئے۔ پانی پت میں زیر قلعہ مدفون ہیں۔ آپ کی قبر پانی پت میں ایک چھوٹے سے احاطہ کے اندر مشہور و معروف ہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ حکیم محمد حسن و حکیم عبدالرحیم ابناء حکیم عبدالکریم المعروف "حکیم بینا" طبیب دربار اکبری کے خیرالخلف تھے۔ کشمیر سے واپسی کے بعد لاہور کے قریب چاندنی رات میں بادشاہ اکبر ہرنوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اتفاق سے ایک ہرن اپنے حریف کو چھوڑ کر اکبر کی طرف جھپٹا اور اس کی دونوں رانوں کے بیچ میں سینگ مارا، زخم ہو گیا، ورم اور تکلیف بڑھتی گئی۔ علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو ابوالفضل کی رائے سے حکیم بینا کو پانی پت سے معالجہ کے لیے بلایا گیا۔ ایک ماہ سات روز کے بعد

صحت ہوگئی۔ شہنشاہِ اکبر نے حکیم بینا صاحب کو "شیخ الزماں" کا شاہی خطاب عطا کیا۔ حکیم محمد حسن بھی اپنے والد کے ساتھ بادشاہ کے علاج میں ہمہ تن مصروف خدمت رہے اس لیے مورد الطاف شاہی ہوئے اور کیرانہ بطور جاگیر عطا ہوا۔ فرمان کی نقل درج ذیل ہے:

"فرمان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ بضمن معافی و عطائے جاگیر کیرانہ مع علاقہ خوانین رفیع مقدار و سلاطین و امرائے باوقار و صدور وزرا و کفایت شعار و عمال ممالک ہندوستان صانہا اللہ عن آفات الزماں۔ چوں فضائل مآب کمالات اکتساب حکمت شعار، مسیحا آثار، شیخ حسن در ازالہ امراض و اعراض انسان بقدر الوسع و الامکان بساط احسان و امتنان بظہور رسانیدہ دمی رساند، بنابراں عنایات و التفاتِ بے غایات شامل حال و کافل آمال آں فضائل مآب گردانیدہ۔

فرمان واجب الاتباع شرف نفاذ یافت کہ موازی پانصد بیگہ زمین مزروع از موضع ڈوماکھیڑی، کھندراؤلی پرگنہ کیرانہ من اعمال میان دو آب حضرتِ دہلی بعوض مبلغ دہ ہزار تنکہ وادیگہ ازاں موضع بموجب فرمان عالی شان حضرت و دو قلبہ زمین از سواد قصبہ پرگنہ مذکور متعلق بشار الیہ مفوض و متعلق بشار الیہ بود بحال باشد، کہ واجبی آنرا سال بسال کسویکال افزوند و معاش خود کند و ازالہ امراض زمرۂ انام بغایت اہتمام بظہور رساند و داروغہا و عمال آں پرگنہ را می باید کہ زمین ہائے مذکور را بتصرف او گذارند و اخراجات و کل تکالیف جوبی مزاحمت نسازند، و مضاف و مسلم دانستہ بہیچ وجہ پرامون نگردند و ہر سال بفرمان محتاج ندارند۔

تحریر بتاریخ شہر ذیقعدہ ۹۱۵ھ ہجری"

حکیم محمد حسن شاہزادہ سلیم کے طبیب خاص تھے۔ شاہزادہ نے "مقرب خاں" خطاب دیا۔ جہانگیر نے تخت نشینی کے بعد "مقرب الخاقان" اور "نائب السلطان" کے خطابات سے نواب مقرب خان کو سرفراز کیا اور پنجہزاری کا منصب دیا۔ تخت نشینی کے کچھ عرصہ کے بعد

جہانگیر نے نواب مقرب خاں کو صوبہ دکن و گجرات کا گورنر مقرر کیا۔ ۱۶۱۸ء میں شہزادۂ شاہ جہاں جب وہاں بھیجے گئے تو نواب مقرب خاں کو صوبہ بہار کا گورنر معین کیا۔ مسٹر ہوجز (HODJES) انگریزی سیاح و مصور اُن کی صوبہ داریٔ بہار کے زمانہ میں جولائی ۱۶۲۰ء میں پٹنہ آیا تھا اور نواب مقرب خاں کا مہمان رہا۔ حسن سلوک سے اس کے ساتھ پیش آئے۔ مسٹر ہوجز کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر نواب مقرب خاں کا رعب بہت غالب تھا اور یہ خطوط شکریہ کے جذبات سے لبریز نظر آتے ہیں جن میں نواب صاحب کے بہت سے حالات لکھے گئے ہیں۔ ۱۶۲۱ء میں صوبہ دہلی و آگرہ کی حکومت پر سرفراز ہوئے شاہ جہاں جب تخت نشین ہوئے تو نواب مقرب خاں کو مزید انعام و اکرام کے ساتھ مضافات کیرانہ کے پرگنے جاگیر میں عطا ہوئے۔ نواب مقرب خاں کے لڑکے حکیم رزق اللہ شاہ جہاں کے طبیبِ دربار اور ہشت صدی منصب دار تھے۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم رزق اللہ کو خطاب "خانی" مرحمت فرمایا۔ ۱۶۶۸ء میں حکیم رزق اللہ صاحب نے وفات پائی۔

دیوان عبدالرحیم اور دیوان عبدالحکیم نواب مقرب خاں کے یہ دونوں چھوٹے بھائی بھی اصحابِ مناصب وجاہ تھے۔ دیوان عبدالرحیم نواب مقرب خاں کی گورنریٔ دکن و گجرات وغیرہ کے زمانہ میں طبیب دربار جہانگیری رہے۔ ان کی اولاد میں آج تک طب کا سلسلہ اور خدمتِ خلق کا جذبہ باقی ہے۔ دیوان حکیم عبدالرحیم کی اولاد میں ہر ایک اپنے وقت کا کاملِ فن طبیب تھا۔

حکیم وجیہ الدین صاحب مصنف کتاب "مخزن حکمت" طب ویدگ جو ۱۱۹۶ھ میں لکھی گئی اور حکیم علی اکبر صاحب مرحوم برادر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۹۱۵ھ میں فرمان اکبری کے مطابق کیرانہ و مضافات کیرانہ نواب مقرب خاں کو بطور جاگیر عطا ہوا تو عثمانی النسب جلالی خاندان کا یہ حصہ پانی پت کی سکونت ترک کر کے کیرانہ میں آباد ہوا۔ اس معمولی قصبہ کی توسیع و تنظیم کی گئی۔ قصبہ سے باہر نواب مقرب خاں اور دیوان عبدالرحیم نے اپنے محلات، کچہریاں اور متعلقین ریاست کے مکانات وغیرہ بنائے جو اب قصبہ کی آبادی

کا ایک جزو ہیں۔ نواب مقرب نے کیرانہ میں آموں اور دیگر اقسام کے پھلوں کا باغ لگایا جس میں گجرات دکن اور دور دست ممالک سے آموں کے درخت منگا کر لگائے۔ ایک سو چالیس بیگہ اس باغ کا رقبہ تھا۔ باغ کے وسط میں دو سو بیس گز لمبا دو سو گز چوڑا حوض بنوایا۔ حوض کے اندر ماہتابی وغیرہ بیس گز مربع میں بنوائی۔ اس حوض میں جمنا کا پانی ایک طرف سے آتا اور دوسری طرف سے نکلتا تھا۔ سرد اور گرم ملکوں کے درخت نصب کرائے۔ سولہویں جلوس میں جہانگیر خود کیرانہ آیا۔ اس باغ کی تفصیلات "تزک جہانگیری" میں موجود ہیں۔ جہانگیر لکھتے ہیں:

> "مخلص وعب خاص، یار وفادار مقرب خاں متمنی تھا کہ میں اس کے یہاں آؤں میں نے اس کے گھر کو قدوم میمنت لزوم سے قابل رشک بنا دیا اور اس خیر خواہ قدیم کو بیش قیمت سامان، قیمتی جواہرات تین لاکھ روپے، ایک باغ اور ایک وسیع مکان دیا۔"

نواب مقرب خاں کے لگائے ہوئے باغ کے آم حسب روایت "تاج المآثر" مدتوں تک دہلی میں مشہور و مرغوب رہے۔ وہ پرانی دنیا اگرچہ انقلاب ۱۸۵۷ء میں اجڑ چکی مگر یہ یادگار زمانہ باغ جس زمین پر قائم تھا وہ اب بھی "نولکھا زمین" کے نام سے معروف ہے۔ مشہور ہے کہ اس باغ میں چھوٹے بڑے ہر قسم کے نولاکھ درخت تھے۔ باغ میں نواب مقرب خاں کی بنائی ہوئی بارہ دری بھی موجود ہے۔ جس زمانہ میں نواب مقرب خاں گجرات کے گورنر تھے اور بندرگاہ سورت بھی ان کے زیر اثر تھی۔ اس وقت انھوں نے اپنی حکمت عملی سے سات جہاز جو مدت سے غرقاب تھے سمندر سے نکلوائے۔ علاوہ دیگر اشیاء کے کسوٹی (سنگ سماق) کے چند ستون نادر الوجود بھی برآمد ہوئے۔ ان اشیاء کی اطلاع شہنشاہ جہانگیر کو دی گئی۔ شاہی حکم سے یہ تمام سامان نواب مقرب خاں کو عطا ہوا۔ مذکورہ بالا تالاب کے وسط میں چبوترہ پر جو بنگلہ تعمیر کیا گیا تھا اس میں کسوٹی کے یہ ستون لگوائے گئے، جو اب حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کی درگاہ پانی پت میں نصب ہیں۔ نواب مقرب خاں کے اس باغ کے مشرقی جانب سنگین عمارات کا سلسلہ تھا جو "دربار" کے نام سے معروف تھا۔ یہاں عدالتیں، فیل خانے اور ریاست کے

دفاتر وغیرہ تھے۔ باغ کے دوسری جانب سکونتی محلات وغیرہ تھے جو"نواب دروازہ" کے نام سے اب تک موسوم ہے۔ یہ پرانی عمارتیں زمانے کے ناسازگار حالات اور پھر انقلاب ۱۸۵۷ء کی تباہ کاری میں برباد ہوگئیں مگر دربار اور نواب دروازہ کے سر بہ فلک اور عالی شان پھاٹک، نقار خانے اور کچھ عمارتیں پرانی شان وشوکت کی یاد کو زندہ اور باقی رکھنے کے لیے اب تک موجود ہیں۔ الدوام للہ۔ نواب صاحب کا مزار پانی پت میں حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے احاطہ میں موجود ہے۔ قبر کا تعویذ اصلی زہر مہرہ کے ایک ٹکڑے کا ہے۔ جس کا وزن ۲۷ من کا بیان کیا جاتا ہے۔ دیوان عبدالرحیم کے مزار کا افسوس ہے کہ پتہ نہ چل سکا۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کی ولادت باسعادت اسی "محلۂ دربار" میں اپنے آباء واجداد کے ان تاریخی مکانات میں ہوئی۔ بارہ برس کی عمر میں قرآن ختم کرنے کے ساتھ دینیات اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے بزرگوں سے پڑھیں اس کے بعد دہلی بغرض تعلیم تشریف لے گئے اور مولانا محمد حیات صاحبؒ کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ قیام بھی مدرسہ میں رہا۔ سنہ ۱۲۵۰ھ میں حضرت مولانا مرحوم کے والد مولوی خلیل اللہ صاحب مرحوم دہلی میں مہاراجہ ہندو راؤ بہادر کے میر منشی مقرر ہوئے اور دھیرج پہاڑی کے قریب ان کا قیام ہوا تو مولانا اپنے والد ماجد کے پاس تشریف لے آئے دن میں مدرسہ مولانا محمد حیات میں تعلیم حاصل کرتے اور رات کو مہاراجہ کو اکبر نامہ سناتے تھے۔ کچھ عرصہ تک حضرت مولانا مرحوم نے بھی مہاراجہ ہندو راؤ کے یہاں بحیثیت میر منشی کام کیا ہے۔ تحصیل علم کا شوق مولانا کو لکھنؤ لے گیا۔ چند رفقاء کے ساتھ آپ لکھنؤ پہنچے اور مفتی سعد اللہ صاحب مرحوم سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔ مولانا محمد حیات صاحبؒ۔

۲۔ مولانا مفتی سعد اللہ صاحبؒ۔

۳۔ مولانا احمد علی صاحبؒ۔ بڈولی ضلع مظفر نگر۔ جو آخر میں وزیر ریاست پٹیالہ ہو گئے تھے۔

۴۔ عارف باللہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب چشتیؒ۔ یہ استاد شاہ وقت تھے۔ تمام

علوم وفنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان سے استفادہ کے زمانے میں حضرت مولانا کے رفقاء میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب پنجابی اور مولانا سید محمد علی صاحب بھی تھے جو اپنے وقت کے فاضل اور صاحبِ فیض بزرگ مانے جاتے تھے۔ مولانا شاہ عبدالرحمٰن صاحب چشتی اور ان کے استاد مولانا محمد حیات صاحبؒ مرحوم بستی نظام الدین اولیاء دہلی میں مدفون ہیں۔

۵۔ مولوی امام بخش صہبائی صاحب۔

۶۔ حکیم فیض الحق صاحب۔ حکیم صاحب اپنے زمانے کے مشہور باکمال طبیب تھے خاندانی روایات کے مطابق حضرت مولانا مرحوم نے حکیم صاحب سے علم طب کی تکمیل کی۔

۷۔ مصنف لوکارثم سے ریاضی حاصل کی۔

ہندوستان میں حضرت مولانا کے درس وتدریس کا زمانہ بہت محدود ہے۔ زمانے کے ناسازگار حالات اور خاص طور پر ہندوستان میں نصاریٰ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کی فکر نے آپ کو اس کا موقعہ نہ دیا کہ اطمینان کے ساتھ تعلیم وتدریس کا فیض عام جاری کرتے۔ تکمیل تعلیم اور اکبرآباد آگرہ کے یادگار زمانہ مناظرہ کے درمیانی عرصہ میں چند سال تک دربار کیرانہ کی مسجد میں حضرت مولانا نے ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ اس مدرسہ کے فیضیاب طلبہ میں سے چند خاص نام درج ذیل ہیں، جو ہندوستان میں حضرت مولانا کے خاص تلامذہ تھے۔ ان میں سے بعض اصحاب نے مکہ معظمہ بھی پہنچ کر حضرت مولانا سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

۱۔ مولانا عبدالسمیع صاحب رام پوری، مصنف حمد باری۔

۲۔ مولانا احمدالدین صاحب چکوالی۔

۳۔ مولانا نور احمد صاحب امرتسری۔

۴۔ مولانا شاہ ابوالخیر صاحب۔

۵۔ مولانا شاہ شرف الحق صاحب صدیقی۔

۶۔ مولوی قاری شہاب الدین صاحب عثمانی کیرانوی۔

۷۔ مولانا حافظ الدین صاحب دجانوی۔

۸۔ مولانا امام علی صاحب عثمانی کیرانوی۔

۹۔ مولانا عبدالوہاب صاحب ویلوری بانی مدرسۂ باقیات الصالحات مدراس۔

۱۰۔ مولانا بدرالاسلام صاحب عثمانی کیرانوی مہتمم حمیدیہ کتب خانہ شاہی قسطنطنیہ۔

۱۲۵۶ھ ہجری میں حضرت مولانا مرحوم کی اپنی خالہ کی لڑکی سے شادی ہوئی۔ ۱۲۷۵ھ میں پھر مہاراجہ ہندوراؤ نے آپ کو اور آپ کے والد ماجد کو اپنے پاس دہلی باڑہ ہندوراؤ میں بلالیا اور حضرت مولانا مرحوم کو اپنا میر منشی مقرر کیا اور ان کے والد ماجد کے ذمہ جائداد کی نگرانی اور دیکھ بھال کا کام سپرد ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد مولوی خلیل اللہ صاحب (عرف خلیل الرحمٰن) کا انتقال ہوگیا اور بعض خانگی مجبوریوں کی بنا پر حضرت مولانا مرحوم نے مہاراجہ ہندوراؤ کے یہاں اپنی جگہ پر اپنے چھوٹے بھائی مولوی محمد جلیل صاحب کو ملازم رکھ کر علیحدگی اختیار کی اور کیرانہ پہنچ کر درس و تدریس کے ساتھ رد نصاریٰ کی مذہبی خدمت میں مصروف ہوئے اور ازالۃ الاوہام لکھنی شروع کی۔

"ازالۃ الاوہام" زیر ترتیب تھی کہ حضرت مولانا مرحوم سخت علیل ہوئے۔ اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے۔ اشارہ سے نماز ادا ہوتی تھی۔ اقرباء و اعزاء، تلامذہ اور تیمار دار بڑھتی ہوئی کمزوری اور شدتِ مرض سے پریشان تھے۔ ایک روز نماز فجر کے بعد آپ رونے لگے۔ تیمار دار سمجھے کہ زندگی سے مایوسی ہے۔ اعزا نے تسلی و تشفی کرنی چاہی۔ آپ نے فرمایا:

"بظاہر صحت کی کوئی علامت نہیں۔ لیکن انشاء اللہ صحت ہوگی، رونے کی وجہ یہ ہے کہ خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی ساتھ ہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ فرماتے ہیں، اے جوان! تیرے لیے رسول اللہؐ کی یہ خوشخبری ہے کہ اگر تالیف ازالۃ الاوہام مرض کی وجہ ہے تو وہی باعثِ شفا ہوگی۔"

حضرت مولانا مرحوم نے فرمایا کہ اس خوشخبری کے بعد مجھے کوئی رنج و ملال نہیں، بلکہ مسرور اور خوش ہوں اور فرطِ مسرت سے یہ آنسو نکل آئے۔ الحمد للہ کہ اس کے بعد صحت و عافیت ہوگئی اور ازالۃ الاوہام کی ترتیب و تالیف کا کام شروع کردیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ عیسائیوں نے ہندوستان میں اسلام کے خلاف زبردست مہم جاری کر رکھی تھی۔ پادری فنڈر (Revd. C. G. P. Fonder) اور اس کی جماعت نے دل شکن تقریروں کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔ پادری فنڈر کی کتاب "میزان الحق" نے عوام میں خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا، خاص طور پر علمائے کرام

کی خاموشی سے مشنری کا جہلا پر کافی اثر ہونے لگا تھا اور پادری علما کی خاموشی سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگے۔ علمائے اسلام نے تیاری شروع کی۔ مقابلہ کے لیے مواد فراہم کیا گیا اور اسلام کی حقانیت وصداقت اور اللہ کا نام بلند کرنے کے لیے رد نصاریٰ کی مذہبی جنگ کے قائدِ اول حضرت مولانا مرحوم نے اعلان کیا:

"میں نے ہندوستان کے سب سے بڑے پادری جو علمائے مسیحین میں ممتاز حیثیت کا مالک اور میزان الحق کا مصنف تھا اس سے خواہش ظاہر کی کہ وہ میرے ساتھ مجمع عام میں مناظرہ کرے تاکہ حق واضح ہوجائے اور یہ معلوم ہوجائے کہ علمائے اسلام نے ان رسائل کی تردید اس لیے نہیں کی کہ وہ عاجز تھے بلکہ جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔"

(اظہار الحق ص ۲)

حضرت مولانا مرحوم اپنے شفیق دوست مولوی محمد امیر اللہ صاحب میر مختار راجہ صاحب بنارس (جو پادری فنڈر سے بھی واقف تھے) کے ساتھ پادری فنڈر کے مکان پر گئے تاکہ مناظرہ کے لیے گفتگو کریں۔ پادری اپنے مکان پر نہ ملے چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۸۵۴ء سے حضرت مولانا مرحوم نے پادری فنڈر سے خط وکتابت شروع کی۔ اس مذہبی مراسلت کا سلسلہ حضرت مولانا مرحوم کے آخری خط مورخہ ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء پر ختم ہوا۔ عنوان مناظرہ، مقام اور تاریخ مناظرہ طے ہوئے۔ طرفین کے اتفاق سے ابتدائی مراحل مکمل ہونے کے بعد پیر کے روز ۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء کو علی الصباح کٹرہ عبدالمسیح اکبرآباد آگرہ میں مناظرہ کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کے ساتھ ڈاکٹر محمد وزیر خاں مرحوم اور پادری فنڈر کے ساتھ پادری فرنچ تھے۔ مجلس مناظرہ میں مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی مسٹر کرسچن سکنڈ صدر صوبہ بورڈ۔ مسٹر ولیم، مجسٹریٹ علاقۂ فوج۔ مسٹر لیڈلی ترجمان حکومت پادری ولیم گلبن۔ مفتی ریاض الدین صاحب۔ مولوی فیض احمد صاحب سررشتہ دار صدر بورڈ۔ مولوی حضور احمد صاحب، مولوی امیر اللہ صاحب مختار راجہ صاحب بنارس۔ مولوی قمر الاسلام امام جامع مسجد آگرہ۔ منشی خادم علی صاحب مہتمم مطلع الاخبار و منشی سراج الحق صاحب حاضرین میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ عوام کو اس مناظرہ سے بے حد دلچسپی تھی۔ سب سے پہلے پادری فنڈر نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ مناظرہ کیوں کر منعقد ہوا۔ یہ مولانا رحمت اللہ کی سعی و کوشش اور خواہش کا نتیجہ ہے۔ اس سے فائدہ کی صورت میرے نزدیک نظر نہیں آتی۔ میری تمنا یہ ہے کہ دین عیسوی کی حقیقت مسلمانوں کے سامنے رکھوں۔ مباحثہ کے عنوان: نسخ و تحریف اناجیل، الوہیت مسیح، تثلیث اور رسالت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) طے ہوئے ہیں۔"

پادری فنڈر کے بعد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کھڑے ہوئے اور نسخ و تحریف انجیل پر فاضلانہ بحث کی اور خود عیسائیوں کی مطبوعات سے نسخ و تحریف ثابت کر دیا۔ بالآخر پادری فنڈر نے ڈاکٹر محمد وزیر خاں صاحب کے جواب میں کہا کہ سات آٹھ جگہ تحریف و تبدیلی ہوئی ہے۔ مولوی قمر الاسلام صاحب امام جامع مسجد آگرہ نے منشی خادم علی خاں صاحب سے فرمایا کہ "لکھو کہ پادری صاحب آٹھ جگہ تحریف ہونے کے اقراری ہیں۔ پادری فنڈر نے کہا کہ "ہاں بہت اچھا ہے۔ لکھیے اور اس حد تک تحریف ضرور ہوئی ہے، لیکن کتب مقدسہ میں اس سے نقصان نہیں ہوا۔ حضرت مولانا مرحوم نے فرمایا کہ "جس وثیقہ میں ایک جگہ تحریف ثابت ہو جائے تو وہ قابلِ اعتبار نہیں رہتا اور جب کہ سات آٹھ جگہ کا اعتراف خود پادری صاحب کرتے ہیں۔" وقت کافی ہو چکا تھا۔ پادری فنڈر کے ایماء پر مناظرہ دوسرے دن کے لیے ملتوی کیا گیا۔

دوسرے روز ۱۲ رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۱ اپریل ۱۸۵۴ء منگل کے دن صبح کو جلسۂ مناظرہ پھر منعقد ہوا۔ جس میں مسٹر اسمتھ صدر دیوانی۔ مسٹر ریڈ صدر بورڈ۔ مسٹر ولیم مجسٹریٹ علاقہ فوج۔ پادری ولیم گلبن۔ پادری ہارلی۔ مفتی ریاض الدین صاحب۔ مفتی اسد اللہ صاحب صدر الصدور مولوی فیض احمد صاحب سررشتہ دار صدر بورڈ۔ مولوی حضور احمد صاحب۔ مولوی امیر اللہ صاحب مختار راجہ صاحب بنارس۔ مولوی قمر الاسلام صاحب امام جامع مسجد آگرہ۔ مولوی امجد علی صاحب وکیل۔ مولوی سراج الحق صاحب۔ منشی خادم علی صاحب مہتمم "مطلع الاخبار"۔ مولوی امیر علی شاہ صاحب۔ مولوی قمر الدین خانصاحب مہتمم اسعد الاخبار۔ مولانا مظفر علی شاہ صاحب جعفری قادری۔ سید صفدر علی صاحب شکوہ آبادی۔ پنڈت جگل کشور۔ مولوی فیض احمد صاحب بدایونی۔ مولوی امیر اللہ صاحب وکیل۔ مولوی معین الدین صاحب۔ سید باقر علی صاحب ناظم محکمہ دیوانی۔ مولوی کریم اللہ خاں صاحب بچھڑایونی۔

سید حافظ حسین صاحب۔ حافظ خدا بخش صاحب۔ ڈاکٹر الہام اللہ صاحب گوپاموی۔ مفتی انعام اللہ صاحب ساحر۔ قاضی باقر علی خاں صاحب ہمدانی۔ راجہ بلوان سنگھ کاشی۔ مولوی سید مدد علی صاحب تپش۔ مرزا زین العابدین صاحب عابد۔ ڈاکٹر مکند لال۔ حکیم فرزند علی گوپاموی۔ سید فضل حسین صاحب۔ ڈاکٹر وزیر الدین صاحب فرخ آبادی۔ حکیم جواہر لال صاحب۔ غلام محمد خاں صاحب۔ خلیفہ گلزار علی صاحب اسیر۔ غلام قطب الدین خاں صاحب باطن۔ مولوی سراج الاسلام صاحب اور دوسرے علماء و روسائے شہر موجود تھے۔

پہلے دن کے مناظرہ کی شہرت عام ہو چکی تھی اس لیے دوسرے دن ایک ہزار سے زیادہ حاضرین کی تعداد تھی۔ اس اجلاس میں بھی تحریف انجیل کی بقیہ بحث جاری رہی۔ پادری صاحبان ہر موقع پر گریز کرتے رہے۔ شکست خوردہ کی برافروختگی طبعی امر ہے۔ اس لیے پادری فرنچ ترش روئی کا اظہار کرنے لگے۔ یہ مناظرہ بھی بلا اختتام بحث ختم ہوا مگر پادری فنڈر نے عام مناظرہ اور مجمع عام میں گفتگو سے پہلو تہی کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد وزیر خاں سے مراسلت جاری کی۔ یہ خط و کتابت یکم مئی ۱۸۵۴ء سے شروع ہوئی اور ۱۶ اگست ۱۸۵۴ء کو ختم ہوئی۔ پادری فنڈر لاجواب ہو چکے تھے اس لیے ڈاکٹر محمد وزیر خاں صاحب اپنے پہلے خط میں پادری فنڈر کو لکھتے ہیں:

"پہلے آپ مولانا رحمۃ اللہ صاحب کی باتوں کا جواب دیجیے اس کے بعد اگر مباحثہ کرنا ضروری ہے تو اپنی کتب دینیہ سے ہاتھ دھو کر اور ان کو موافق اصلاح اہلِ اسلام کے منسوخ و محرف مان کر تثلیث کے میدان میں قدم رکھیے۔ جب یہ مسئلہ طے ہو جائے گا تو حضرت خاتم المرسلین کی نبوت کے عنوان پر گفتگو کی جائے گی۔"

حضرت مولانا مرحوم کا دعویٰ تھا کہ جس مذہب کی طرف تم دنیا کو بُلاتے ہو اس کی آسمانی کتاب اپنی اصلی حالت میں نہیں ہے اور جس کتاب کو تم مذہبی کتاب کہتے ہو وہ ناقابلِ اعتبار ہے پیشوایانِ مذہب عیسوی نے انجیل میں بہت کچھ تحریف کر دی ہے، اسی لیے آج دنیا میں دین عیسوی کی بنیاد کھوکھلی ہے۔

مناظرۂ اکبرآباد میں یہ شرط خاص اہمیت رکھتی تھی کہ اگر حضرت مولانا مرحوم پادری فنڈر کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکے تو مذہب عیسوی اختیار کر لیں گے۔ اسی طرح پادری

فنڈر اگر مولانا مرحوم کے سوالات کا جواب نہ دے سکے تو وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ اس مناظرہ میں حضرت مولانا مرحوم کے ذمہ رسول مقبول کی رسالت کو ثابت کرنا۔ کلام پاک کا آج تک بلا تحریف اور تغیر سے بالکل محفوظ آسمانی کتاب ہونا اور ابطال تثلیث کے ساتھ تحریف انجیل کا مدلل ثبوت پیش کرنا تھا اس کے مقابلہ میں پادری فنڈر کو اثبات تثلیث کے ساتھ موجودہ انجیلوں کو وہی صحائف آسمانی ثابت کرنا تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئیں اور ان میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی۔ حضرت مولانا مرحوم نے اپنی خداداد قابلیت اور تائید غیبی سے دو روز کے مناظرہ میں اس امر کو ثابت کر دیا کہ موجودہ انجیل جس پر عیسائیوں اور پادریوں کو ناز ہے تحریف شدہ ہے جس کا اقرار پادری فنڈر نے جلسۂ عام میں کر لیا۔

تیسرے دن مناظرہ نہ ہوا اور پادری فنڈر نے عام مجمع کے سامنے آنے کے بجائے اپنی خفت مٹانے کے لیے حضرت مولانا مرحوم کو خط لکھا کہ: "آپ نے مناظرہ میں جن عبارتوں کے حوالے دیے ہیں، آپ کے کہنے پر میں نے سمجھ لیا کہ ایسا ہی ہوگا۔ لیکن میں "حل الاشکال" بھیج رہا ہوں اس میں ملاحظہ کیجیے وہ مقصد نہیں ہے جو جناب نے بیان کیا ہے۔"

حضرت مولانا مرحوم نے اس گریز کا مدلل اور معقول جواب دیا۔ یہ خط و کتابت مولانا مرحوم اور پادری فنڈر کے درمیان ۲۳ اپریل ۱۸۵۴ء تک جاری رہی۔ اس مناظرہ کی پوری کیفیت "البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف" کے نام سے وزیر الدین صاحب نے مرتب کی جو حافظ عبد اللہ صاحب کے اہتمام سے ۱۲۷۰ھ میں "فخر المطابع" شاہجہاں آباد دہلی میں کتاب کی شکل میں چھپی اور ولی عہد مرزا فخر الدین بن سراج الدین بہادر بادشاہ دہلی کے حکم سے چھپ کر اور انہی کے حکم سے ہندوستان کے اطراف و اکناف میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ کتاب صرف مناظرہ اکبر آباد آگرہ اور حضرت مولانا مرحوم و پادری فنڈر کے آخری خطوط کا مجموعہ ہے۔

مناظرۂ اکبر آباد کو چھوٹی تقطیع پر حصہ اول "مباحثۂ مذہبی" اور دوسرا حصہ "مراسلات مذہبی" کے نام سے سید عبد اللہ صاحب اکبر آبادی نے منشی محمد امیر صاحب کے اہتمام سے "مطبعۂ منعیہ" اکبر آباد سے ۱۲۷۰ھ میں چھپوایا۔ پہلا حصہ فارسی میں تقریری مناظرہ

کی روئیداد ہے۔ دوسرے حصے میں ڈاکٹر محمد وزیر خاں صاحب اور پادری فنڈر کا تحریری مناظرہ اردو میں ہے۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ اظہار الحق کے حاشیہ پر مطبوع ہے جو مطبعہ محمودیہ قاہرہ میں ۱۳۱۶ھ میں طبع ہوا۔

حضرت مولانا مرحوم نے فتنۂ مسیحیت کے استیصال اور روک تھام کی غرض سے جو کتابیں رد نصاریٰ میں تصنیف وتالیف کیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اظہار الحق:

خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالعزیز خاں اور خیرالدین پاشا تونسی صدر اعظم کی تحریک پر پادری فنڈر سے اکبر آباد آگرہ میں مناظرہ کی مفصل کیفیت اور تمام مسائل کا نہایت بسط وشرح کے ساتھ بیان ہے۔ ۱۶ رجب ۱۲۸۰ھ میں قسطنطنیہ میں اس کتاب کی تالیف شروع کی اور آخر ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ میں ختم ہوئی اور ۱۲۸۱ھ میں سب سے پہلے قسطنطنیہ میں چھپی۔ صدر اعظم موصوف کے حکم سے ایک ترک عالم نے عربی سے ترکی میں اس کا ترجمہ کیا اور "ابراز الحق" کے نام سے مکمل ترکی ترجمہ شائع ہوا، نیز یورپ کی متعدد زبانوں میں حکومت عثمانیہ کی طرف سے اس کے ترجمے شائع کیے گئے جن کو پادریوں نے خاص اہتمام اور کوشش سے تلف کیا۔ مصر میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے، مولوی سلیم اللہ صاحب مرحوم نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا تھا جس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ مولوی غلام محمد صاحب بہانجا راندیری نے بڑی محنت وجانکاہی سے گجراتی میں ترجمہ کیا جو شائع ہو چکا ہے۔ اظہار الحق کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت کے بعد "ٹائمز آف لندن" نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> "لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دُنیا میں مذہب عیسوی کی ترقی بند ہو جائے گی"

نواب حاجی اسمٰعیل خانصاحب مرحوم رئیس دتاؤلی ضلع علی گڑھ نے مکہ معظمہ میں حضرت مولانا مرحوم کو ٹائمز کا یہ تراشا اور اظہار الحق کے متعلق اس کا مذکورہ بالا ریویو خاص طور پر دیا تھا۔ رد نصاریٰ میں صرف یہی ایک کتاب ایسی ہے جس کا جواب یا رَد آج تک مسیحی دنیا

نہ دے سکی۔

"تائید الحق برحمۃ اللہ" اس کا تاریخی نام ہے۔ "اظہار الحق" ایک مقدمہ اور چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابواب کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو:

۱۔ باب اول: بیان و تفصیل کتب عہد قدیم وجدید۔
۲۔ باب دوم: " " اثبات تحریف انجیل۔
۳۔ باب سوم: " " نسخ انجیل۔
۴۔ باب چہارم: " " ابطال تثلیث۔
۵۔ باب پنجم: قرآن کا کلام اللہ ہونا۔
۶۔ باب ششم: اثبات نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور پادریوں کے اعتراضات کی تردید۔

۲۔ ازالۃ الاوہام:

یہ کتاب ۴۵۶ صفحات پر سید المطابع کوچہ بلاقی بیگم دہلی میں سید قوام الدین صاحب کے زیر اہتمام فارسی میں ۱۲۶۹ھ میں بڑی تقطیع پر چھپی۔ رد نصاریٰ کے اکثر مباحث کا مسکت جواب ہے۔ اس میں پادری فنڈر کے "میزان الحق" میں اعتراضات کے دنداں شکن جوابات بھی ہیں۔

۳۔ ازالۃ الشکوک:

یہ کتاب عیسائیوں کے انتالیس سوالوں کا جواب ہے۔ ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں تصنیف ہوئی اور دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس میں نبوت محمدی اور تحریف بائبل کے مدلل ثبوت ہیں۔ دونوں جلدیں ۱۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس کتاب کی سبب تالیف کے متعلق حضرت مولانا مرحوم دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> "۱۲۶۹ھ دو امر باعث ہوئے کہ ان (پادریوں کے سوالات) کا جواب لکھوں، ایک یہ کہ بعض عیسائیوں نے ان سوالوں میں اصلاح دے کر اور چھ سوال اور بڑھا کر ان کو جناب مستطاب مرزا محمد فخر الدین ولیعہد بہادر دام اجلالہ کی خدمت بابرکت میں بھیجا اور جناب معظم الیہ نے مجھ سے درخواست کی کہ ان کا جواب لکھوں اور

ان کا امر ماننا پڑا۔"

حضرت مولانا مرحوم کے شاگرد رشید شمس العلماء فاضل جلیل مولانا عبدالوہاب صاحب مرحوم ویلوری بانی مدرسہ "باقیات الصالحات" مدراس نے اپنے اہتمام اور صرفہ سے مدراس میں پہلی جلد چھپوائی تھی۔ دوسری جلد مولانا موصوف کے خلف ارشد مولانا ابوالفضل ضیاءالدین محمد صاحب مرحوم مہتمم مدرسۂ مذکور نے اپنی نگرانی میں طبع کرائی۔ جلد اوّل اور جلد دوم کی تصحیح وغیرہ خود شمس العلماء مولانا عبدالوہاب صاحب نے ماہِ شعبان ۱۲۸۰ھ میں مکمل فرمائی جس کے مطابق یہ دونوں جلدیں طبع ہوگئیں۔

۴۔ اعجازِ عیسوی:

اس کتاب میں حضرت مولانا مرحوم نے کامل طور پر بائبل کا غیر معتبر اور محرف ہونا ثابت کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۲۶۹ھ میں آگرہ میں لکھی گئی۔ پہلی بار آگرہ میں اور دوسری مرتبہ مطبعۂ رضوی دہلی میں طبع ہوئی۔ دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔

۵۔ احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث:

دلائل عقلیہ و نقلیہ سے تثلیث کو باطل کیا ہے۔ ۱۲۷۱ھ میں تصنیف ہوئی اور مطبعۂ رضوی دہلی میں ۱۲۹۲ھ میں چھپی۔

۶۔ بروقِ لامعہ:

رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کا مدلل اثبات اور خاتم المرسلین پر ختم رسالت کو ثابت کیا ہے۔ غیر مطبوعہ۔

۷۔ البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف:

۱۲۷۰ھ میں لکھی گئی۔ تحریف انجیل پر محققانہ بحث ہے ۵۶ صفحات اور متوسط تقطیع پر فخر المطابع دہلی میں چھپی ہے۔

۸۔ مُعدِّل اعوجاج المیزان:

یہ کتاب میزان الحق مولفہ پادری فنڈر کا جواب ہے۔ رسالہ "نور افشاں نمبر ۳۰ جلد ۱۲ مطبوعہ ۲۴ جولائی ۱۸۸۶ء میں پادری صفدر علی صاحب کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا قلمی نسخہ اُن کے پاس ہے۔

۹۔ تقلیب المطاعن:

یہ کتاب "تحقیقِ دینِ حق" مولفہ پادری لاسمند کا رَد اور جواب ہے۔ غیر مطبوعہ۔

۱۰۔ معیار التحقیق:

کتاب "تحقیق الایمان" مولفہ پادری صفدر علی کا دنداں شکن جواب ہے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء:

گردشِ زمانہ سے سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گُل ہوا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء نے ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کو تکمیل تک پہنچایا اور کمپنی کا مقصدِ تجارت پورا ہوا۔ سیاسی دنیا میں کسی قوی اور غالب نے آج تک کمزور اور زیر دست کے ساتھ رحم و شفقت کا برتاؤ نہیں کیا۔ رونا صرف اپنی غفلت اور بد اقبالی کا ہے۔ اس زمانہ کے علمار کی ایک عملی جماعت اپنے فرض سے غافل نہ تھی۔ اعلائے کلمۃ اللہ اور احیائے سنت کے مذہبی جذبہ اور دینی فریضہ کی ادائیگی کے لیے یہ جماعت میدان میں آئی، اپنی بساط اور ہمت کے مطابق خدمت کا حق ادا کیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

پرگنہ کیرانہ و شاملی میں زمینداری شیوخ اور مسلمان گوجروں کے ہاتھ میں تھا جن میں دینداری کے ساتھ جوش بھی موجود تھا۔ تھانہ بھون اور کیرانہ کا ایک محاذ قائم کیا گیا۔ مجاہدین کی جماعت مدافعت اور مقابلہ کرتی رہی۔ شاملی کی تحصیل پر حملہ کیا گیا۔ پرگنہ کے چاروں طرف اس مجاہدانہ تحریک کا اثر عام ہو چکا تھا۔ تھانہ بھون میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور مولوی عبد الحکیم صاحب تھانوی مع رفقاء اور نواح کیرانہ میں حضرت مولانا مرحوم گورہ فوج کا مقابلہ کر رہے تھے۔ مجاہدینِ کیرانہ میں چوں کہ مسلمان گوجر زیادہ تھے اس لیے ان کی قیادت چودھری عظیم الدین حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ کر رہے تھے۔ (انقلاب کے بعد چودھری عظیم الدین مکہ معظمہ حضرت مولانا مرحوم کے پاس آ گئے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا) اس زمانہ میں عصر کی نماز

کے بعد مجاہدین کی تنظیم و تربیت کے لیے کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ کی آواز پر لوگوں کو جمع کیا جاتا اور اعلان ہوتا تھا:

"ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا"

اس جملہ کے بعد جو کچھ کہنا ہوتا تھا وہ عوام کو سنایا جاتا۔ اس پرانی آواز کو سننے والوں میں سے اب کوئی نہیں رہا مگر جنھوں نے اپنے بزرگوں سے اس کی صدائے بازگشت سُنی ہے وہ اب تک موجود ہیں۔ کیرانہ کے محاذ پر بظاہر شکست کا امکان نہ تھا۔ مگر بعض ابنائے وطن کی زمانہ سازی اور مخبروں کی سازش نے حالات کا رُخ بدل دیا۔ کیرانہ میں گورہ فوج اور توپ خانہ داخل ہوا۔ محلہ دربار کے دروازے کے سامنے توپ خانہ نصب کیا گیا اور گورہ فوج نے محلہ دربار کا محاصرہ کیا۔ ہر گھر کی تلاشی لی گئی۔ عورتوں بچوں اور ہر شخص کو فرداً فرداً دربار سے باہر نکالا گیا۔ اس لیے کہ مخبر نے اطلاع دی تھی کہ مولانا دربار میں روپوش ہیں۔ کیرانہ کے قریب "پنجیٹھ" مسلمان گوجروں کا ایک گاؤں ہے جہاں حضرت مولانا مرحوم اپنی باقی ماندہ جماعت کے ساتھ پہنچے۔ خود "پنجیٹھ" کے لوگ بھی مجاہدین میں شریک تھے۔ اسی دوران میں گورہ فوج کے ایک گھوڑے سوار دستہ نے "پنجیٹھ" کا رُخ کیا۔ کیرانہ اور قرب وجوار کے تمام حالات کی اطلاع حضرت مولانا مرحوم کو ملتی رہتی تھی۔ پنجیٹھ کے مکھیا کو جب فوج کا آنا معلوم ہوا تو اس نے جماعت کو منتشر کر دیا اور حضرت مولانا مرحوم سے خواہش کی کہ کھرپالے کر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں۔ گورہ فوج اسی کھیت کی پگڈنڈی سے گزری۔ حضرت مولانا مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ "میں گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اُڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگ رہی تھیں اور میں ان کو اپنے پاس سے گزرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔"

گورہ فوج نے گاؤں کا محاصرہ کیا۔ مکھیا کو گرفتار کر لیا گیا۔ پورے گاؤں کی تلاشی لی گئی مگر حضرت مولانا مرحوم کا پتہ نہ چلا مجبوراً یہ فوجی دستہ کیرانہ واپس ہوا۔ حالات پر قابو پا لیا گیا اور حضرت مولانا مرحوم کے خلاف فوجداری مقدمہ چلایا گیا، وارنٹ جاری ہوا۔ آپ کو مفرور و باغی قرار دے کر گرفتاری کے لیے ایک ہزار روپیہ کے انعام کا اعلان ہوا۔ حضرت مولانا مرحوم اپنا نام "مصلح الدین" بدل کر پیدل دہلی روانہ ہوئے۔ آپ کے لیے یہ بہت سخت آزمائش کا وقت تھا۔ ایمانی عزم وہمت

اور صبر و استقلال کے ساتھ جے پور اور جودھ پور کے مہیب ریگستانی جنگلوں اور خطرناک راستوں کو پا پیادہ طے کرتے ہوئے سورت پہنچے۔ بندرگاہ سورت سے بھی جہاز کا سفر آسان نہ تھا، بادبانی جہاز چلا کرتے تھے۔ سال بھر میں صرف ایک جہاز ہوا کی موافقت کے زمانے میں سورت سے روانہ ہوتا اور اسی طرح جدّہ سے آیا کرتا تھا۔ ایک خط کا محصول چار روپیہ تھا۔ جو لوگ ہجرت کے ارادہ سے ترکِ وطن کرتے وہ ساتھ ہی دنیاوی تعلقات اور باہمی علائق کو زندگی ہی میں ختم کر دیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا مرحوم کی روانگی اور فوجداری مقدمہ کے بعد آپ کی اور آپ کے خاندان کی جائیداد ضبط ہو کر نیلام ہوئی۔ خاص طور پر پانی پت میں مخبرِ "کمال الدین" کی شناخت پر جو جائیداد قرق کر کے نیلام کی گئی اس کا مختصر بیان درج ذیل ہے۔ جائداد کے نیلام کا فیصلہ ڈپٹی کمشنر کرنال نے ۳۰ر جنوری ۱۸۶۲ء میں کیا۔

سب سرائیں اور وسیع قطعات زمین اور مکانات ایک ہزار چار سو بیس روپیہ میں نیلام ہوئے۔ جن کی لاکھوں روپیہ قیمت تھی۔ مزروعہ علاقے اور زراعتی زمینیں اس سکنائی جائیداد کے علاوہ ہیں۔ جو بحق سرکار ضبط ہوئیں۔

کاغذات جائیداد نیلام شدہ میں انڈکس مشمولہ کا یہ عنوان ہے:

"انڈکس مشمولہ مثل فوجداری مقدمۂ عرضی کمال الدین ساکن کیرانہ حال پانی پت مولوی رحمۃ اللہ باغی۔"

رحمت اللہ بیت اللہ میں:

طویل سفر کے آلام و مصائب کو برداشت کرتا ہوا یہ سربکف مجاہدِ اسلام، مرکزِ اسلام میں پہنچا تاکہ کعبہ کے زیر سایہ خدمت اسلام کا کوئی پہلو نکال سکے۔ ہندوستان میں اس عملی جماعت کے اکثر افراد نے مکہ معظمہ کا رخ کیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ پہلے مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے اور رباطِ داؤدیہ (جو باب العمرہ سے متصل ہے) کے ایک حجرہ میں مقیم تھے۔ صبح صادق کے قریب حضرت مولانا مرحوم مکہ معظمہ پہنچے۔ مطاف میں حضرت حاجی صاحب

مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ طواف قدوم اور سعی میں حضرت حاجی صاحب مرحوم ساتھ رہے۔ اس کے بعد دونوں رباط داؤدیہ میں آئے۔ اس زمانہ میں سید احمد دحلان "شیخ العلماء" تھے اور مسجد حرم میں آپ کا حلقۂ درس مرجع عام تھا۔ شریف عبداللہ بن عون بن محمد "امیر مکہ" تھے، سلطان عبدالعزیز خاں کا دورِ خلافت تھا۔ حضرت مولانا مرحوم نے حالات کا جائزہ لیا اور علمائے مسجد حرم سے تعلقات پیدا ہوئے۔ سید احمد دحلان کے درس کو اکثر سننے کا موقع ملتا۔ موصوف چوں کہ شافعی المذہب تھے اس لیے ایک روز دورانِ تقریر میں کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اپنے مذہب کی ترجیح کے ساتھ احناف کے دلائل کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کی۔ درس ختم ہونے کے بعد حضرت مولانا مرحوم نے سید احمد دحلان سے پہلی مرتبہ ملاقات کی اور اس مسئلہ کے متعلق ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنی تشفی چاہی۔ تھوڑی دیر کے سوال وجواب اور علمی گفتگو سے سید احمد دحلان کو اس کا اندازہ ہوگیا کہ یہ شخص طالب علم نہیں۔ حقیقت حال دریافت کی۔ حضرت مولانا مرحوم نے اختصار کے ساتھ کچھ حالات بیان کیے۔ دوسرے دن اپنے گھر میں دعوت کے لیے حضرت مولانا مرحوم سے فرمایا۔ آپ اپنے رفیق عزیز حضرت حاجی صاحب مرحوم کے ساتھ سید صاحب کے دولت خانہ پر تشریف لے گئے۔ اس مجلس میں حضرت مولانا مرحوم نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے تمام حالات اور خاص طور پر نصاریٰ کی مذہبی کوششوں اور ردِ نصاریٰ میں مسلمانوں کی عظیم الشان کامیابی کی تفصیل بیان کی جس سے بے حد مسرت کا اظہار فرمایا اور حضرت مولانا مرحوم سے دیر تک بغل گیر ہوئے۔ اسی مجلس میں حضرت مولانا مرحوم کو مسجد حرم میں درس کی باقاعدہ اجازت دی اور علمائے مسجد حرم کے دفتر میں آپ کا نام درج کرا دیا۔

قسطنطنیہ سے سلطان عبدالعزیز خاں مرحوم کا فرمان امیرِ مکہ شریف عبداللہ پاشا کے نام آیا کہ "حج کے زمانے میں ہندوستان سے جو علماء اور باخبر اصحاب آئیں ان سے پادری فنڈر کے مناظرہ اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے خاص حالات معلوم کر کے بابِ خلافت کو مطلع کیا جائے۔" امیر مکہ نے شیخ العلماء سید احمد دحلان سے اس فرمان کا تذکرہ کیا۔ موصوف نے فرمایا کہ "جس عالم سے یہ مناظرہ ہوا ہے وہ خود یہاں موجود ہے" ——— امیر مکہ کے حکم سے دوسرے دن حضرت مولانا، شیخ العلماء کے ساتھ امیرِ مکہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سلطان کو حالات سے مطلع کیا گیا اور قسطنطنیہ سے سلطان کی طلبی اور حکم پر امیر مکہ نے حضرت مولانا مرحوم کو ۱۲۸۰ھ مطابق

۱۸۶۴ء میں شاہی مہمان کی حیثیت سے روانہ کیا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد پادری فنڈر جرمنی اور سوئٹزرلینڈ اور انگلستان میں رہا چرچ مشنری سوسائٹی لندن نے اس کو قسطنطنیہ بھیجا تاکہ وہاں کام کرے۔ پادری فنڈر اپنی شرانگیز طبیعت سے مجبور تھا۔ دولت عثمانیہ میں فنڈر اور اس کی جماعت نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ ہندوستان میں عیسائیت کی فتح اور اسلام کو شکست ہو چکی ہے اور علمائے اسلام لاجواب ہو چکے ہیں ہندوستان کے مسلمان مسیحیت کو قبول کر رہے ہیں۔ اس خبر سے بھی سلطان بہت متشوش تھے۔ حضرت مولانا مرحوم کی آمدِ قسطنطنیہ کی خبر سُن کر پادری فنڈر قسطنطنیہ سے روپوش ہوا۔ سلطان نے ایک مجلس علماء منعقد کی جس میں وزرائے سلطنت کے علاوہ اہلِ علم اصحاب کو مدعو کیا گیا اور حضرت مولانا مرحوم سے ہندوستان میں مذہب عیسوی کی شکست اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے حالات سُنے۔ دولت عثمانیہ میں اس فتنہ و فساد کو روکنے کے لیے حکومت نے مسیحی مبلغین کو قید کیا۔ ان کی کتابوں پر پابندیاں لگائی گئیں اور سخت احکامات جاری کیے گئے۔

اکثر نمازِ عشاء کے بعد سلطان بکمال التفات شاہانہ حضرت مولانا مرحوم کو شرف باریابی عطا فرماتے تھے۔ اس وقت خیرالدین پاشا تونسی صدر اعظم اور شیخ الاسلام وغیرہ بھی شریکِ مجلس ہوتے۔ سلطان عبدالعزیز خاں مرحوم نے حضرت مولانا مرحوم کی جلیل القدر دینی مجاہدانہ خدمات کی قدر افزائی فرمائی۔ زریں خلعت کے ساتھ تمغۂ مجیدی درجہ دوم اور گراں قدر وظیفۂ ماہانہ سے سرفراز فرمایا۔

سلطان کی خواہش اور خیرالدین پاشا کی تحریک پر ماہِ رجب ۱۲۸۰ھ میں حضرت مولانا مرحوم نے "اظہار الحق" لکھنی شروع کی، اور آخر ذی الحجہ سنۂ مذکور میں چھ ماہ کے اندر تیار کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کی۔ خیرالدین پاشا نے حضرت مولانا مرحوم سے فرمایا کہ امیرالمومنین کی خواہش پر آپ نے یہ کتاب لکھی مگر اس کے مقدمہ میں آپ نے مکہ معظمہ کے شیخ العلماء کا ذکر کیا ہے حالاں کہ امیرالمؤمنین کا نام آنا چاہیے تھا۔ حضرت مولانا مرحوم نے فرمایا کہ:

"اس خالص مذہبی خدمت میں کسی دنیاوی غرض و مقصد کا کوئی شائبہ نہ آنا چاہیے۔ اس کے علاوہ مکہ معظمہ میں خود شیخ العلماء مجھ سے ان حالات کے قلمبند کرنے

کی خواہش کر چکے تھے اور ابتدائی مواد کی ترتیب کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔
دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی تالیف کا اصل سبب شیخ العلماء ہیں۔ کسی وجہ
سے اگر وہ مجھے امیر مکہ تک نہ پہنچاتے تو میری رسائی یہاں تک نہ ہوتی اور اس
خدمت کا موقع نہ ملتا۔"

حضرت مولانا مرحوم کے عرصۂ قیام قسطنطنیہ میں اکثر علماء اور مختلف مذاق اور خیال کے اہلِ علم وغیرہ اصحاب شاہی مہمان خانہ میں آتے تھے۔ مختلف مذہبی مسائل پر تبصرہ اور تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ یورپ کی تعلیم اور نئی روشنی کا اثر یہاں تک پہنچ چکا تھا اس لیے حضرت مولانا مرحوم نے ضرورت کا احساس کرتے ہوئے بعثت و نبوت اور حشر و نشر، نزول وحی وغیرہ امور کو عقلی دلائل سے ثابت کیا اور "تنبیہات" کے نام سے ان امور پر ایک رسالہ لکھا جس کی تالیف سے جمادی الثانیہ ۱۲۸۱ھ میں فارغ ہوئے۔ یہ رسالہ خیرالدین پاشا تونسی صدر اعظم کے حکم سے طبع ہوا۔ مصر میں اظہار الحق کے بعض مطبوعہ نسخوں کے حاشیہ پر یہ رسالہ چھپا ہوا ہے۔

قسطنطنیہ سے واپسی کے بعد مسجدِ حرم میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ سب سے پہلے حضرت مولانا مرحوم نے معقول سے طلبہ کو روشناس کرایا اور خاص طور پر ریاضی میں علم ہیئت کی تدریس شروع کی، جو حجاز میں تعلیمی حیثیت سے غیر معروف تھا۔ علم صرف مستقل طور پر داخلِ درس نہ تھا بلکہ نحو کے ساتھ علم صَرف کی ابتدائی معلومات پڑھائی جاتی تھیں۔ حضرت مولانا مرحوم نے صَرف کی تعلیم کو نحو سے الگ کیا۔ اسی کے ساتھ یہاں کے طریقۂ درس و تدریس اور مقامی اہم ضرورتوں پر کافی غور کے بعد یہ رائے قائم کی کہ یہاں ایک ایسے دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھا جائے جو مرکزیت کے شایانِ شان ہو، دنیا کی مختلف زبانیں جاننے والے علماء مدرس ہوں اور ایسا نصابِ تعلیم رائج کیا جائے جو دینی اور دنیوی ضروریات کا متکفل ہو۔ اگرچہ سلطنتِ عثمانیہ ان علمائے حرم اور باکمال افراد کی حوصلہ افزائی میں لاکھوں روپیہ بے دریغ صَرف کر رہی تھی جو مسجد حرم میں درس و تدریس میں مشغول تھے مگر اس میں جو نقائص پائے جاتے تھے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ وہ علماء اپنے درس و تدریس کو کسی نظام اور کام کو ضابطہ کی ماتحتی میں انجام نہیں

دے رہے تھے۔

۲۔ کوئی مخصوص نصاب تعلیم رائج و مقرر نہ تھا اور جو کچھ پڑھایا جاتا تھا وہ طلباء میں کسی قسم کی قابلیت و استعداد پیدا نہیں کر سکتا تھا۔

۳۔ طریقۂ تعلیم نہایت ابتر حالت میں تھا اور سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ کتاب کی عبارت کو خود استاد پڑھتا اور خود ہی مطلب بیان کرتا۔ شاگرد اُسے استاد کا ایک وعظ سمجھتے اور اپنے دماغ پر زور ڈالنے کے عادی نہ تھے۔ استاد سے سوال کرنا یا نفس مسئلہ پر اعتراض پیدا کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا، سمجھنے یا توضیح کے لیے استفسار بے ادبی میں داخل تھا۔

۴۔ جو علوم پڑھائے جاتے تھے ان میں نحو، فقہ، تفسیر، حدیث پر تمام عمر ختم ہونے کے باوجود تکمیل یا اعلیٰ قابلیت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ تفسیر جلالین جو عام طور پر ہندوستان میں سال بھر میں پڑھائی جاتی تھی اس وقت سات سال میں ختم ہوا کرتی تھی۔ باقی علوم کے پڑھنے فنون کے حاصل کرنے کا نہ رجحان و شوق تھا اور نہ تبحر و استعداد کے ساتھ پڑھانے کی ہمت تھی۔

۵۔ ان مہاجرین کی اولاد کے لیے جو ممالک اسلامیہ سے ہجرت کر کے آتے ہیں کسی قسم کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ان کی اولاد غیر تربیت یافتہ اور جہالت و بداخلاقی کا شکار تھی نہ وہ دنیا کے کسی کام کی تھی اور نہ دین کے۔

۶۔ مکہ معظمہ کو سرچشمۂ دین اور مرکزِ اسلام خیال کر کے ہر سال اسلامی دنیا کے دور دراز مقامات سے بڑی تعداد میں متلاشیانِ علوم دینیہ اس شوق میں آتے تھے کہ اس چشمہ سے سیراب ہوں۔ مگر اس زمانہ میں یہاں ان طلبہ کی تعلیم کا کوئی انتظام تھا اور نہ قیام وطعام و دیگر ضروریات تعلیم کی کوئی صورت تھی۔

ان تمام حالات اور گردو پیش کی ضرورتوں پر کافی غور کرنے کے بعد یہ پہلا شخص تھا جس نے اہلِ حرم اور شائقین علوم دینیہ کی ضرورت کا احساس کیا اور اپنے حکیمانہ دماغ سے یہ بات پیدا کی کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مٹی ہوئی درس گاہ کا زینِ حرم پر احیاء کیا جائے۔ مہاجرین کی اولاد اور اہلِ عرب کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے انتظام کے ساتھ صنعت و دست کاری سکھانے کے لیے ایک باقاعدہ صنعتی اسکول بھی اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیا

جائے تاکہ اہلِ حجاز اور ان مہاجرین حرم کی اولاد ضروری اور ابتدائی تعلیم کے بعد گداگری اور افلاس کا شکار ہو کر ننگِ اسلام نہ بنیں۔

حضرت مولانا مرحوم مکہ معظمہ کے ہندوستانی مہاجرین اور اہلِ خیر اصحاب کو اس اہم ضرورت کی طرف متوجہ فرماتے رہے۔ اس سلسلہ میں متعدد اجتماعات ہوئے اور یہ طے پایا کہ نواب فیض احمد خانصاحب مرحوم رئیس ضلع علی گڑھ جو اس زمانہ کے طبقۂ مہاجرین میں دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے ممتاز تھے ان کے ذاتی اور مسکونہ مکان کے ایک حصہ میں مدرسہ کی ابتداء کی جائے اور ممتاز ہندوستانی مہاجرین کی ہمدردی اور عملی شرکت اس کارِ خیر کو حاصل رہے۔ مکہ معظمہ کے اس سب سے پہلے مدرسہ کی سب سے پہلی تاریخی اور بنیادی اپیل درج ذیل ہے:

> "حمد و نعت کے بعد عرض یہ ہے کہ اکثر ہندیوں اہلِ توفیق کی ہمت سے حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً میں بعضے بعضے خیر کے کام جیسے رباطیں اور سبیلیں تیار ہو گئی ہیں، پر اب تک کوئی مدرسہ ان کی طرف سے یہاں نہیں ہے۔ حالانکہ اور کاموں سے یہ کام بھی بڑا خیر کا کام ہے، اس لیے یہ عرض ہے کہ جو اس امر میں شریک ہوں وہ اپنا نام مع اس رقم کے جو انھیں ماہانہ دینا منظور ہو لکھ دیں اور تھوڑے بہت کا خیال نہ کریں کہ تھوڑا تھوڑا اکٹھا ہو کے بہت ہو جاتا ہے، اور اس مدرسہ کے تدریس کے اور خرچ کے قواعد ان لوگوں کی رائے سے مقرر ہوں گے جو اس امر کے لیے بمشورہ مقرر کیے جائیں گے۔ فقط
>
> المرقوم یکم ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۲۹۰ہجری قدسی۔

صولت النساء بیگم:

موسم حج سنہ ۱۲۹۰ھ میں کلکتہ کی ایک اولوالعزم اور مخیر خاتون "صولت النساء بیگم صاحبہ" اپنی لڑکی اور داماد کے ساتھ حج کے لیے آئیں۔ ہر نیک دل اور صاحب استطاعت مسلمان کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ حرمین شریفین میں کوئی نیک کام اور صدقۂ جاریہ قائم کر جائے، صولت النساء صاحبہ مرحومہ بھی مکہ معظمہ میں ایک رباط (مسافر خانہ) بنانے کا بہتر جذبہ اپنے ساتھ لائیں۔ موصوفہ کے داماد

اکثر مسجد حرم میں حضرت مولانا مرحوم کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے۔ مشورہ کے طور پر انھوں نے اپنی خوشدامن کے مبارک ارادہ کا ذکر کیا۔ حضرت مولانا مرحوم نے فرمایا کہ "مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں رباطوں اور مسافرخانوں کی کمی نہیں۔ سب سے زیادہ ضرورت ایک مدرسہ کی ہے۔ مکہ معظمہ میں کوئی مستقل مدرسہ نہیں۔" صولت النساء بیگم صاحبہ دوسرے دن حضرت مولانا مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس رائے کو انتہائی مسرت کے ساتھ پسند کرتے ہوئے مدرسہ کے لیے زمین کی خرید وغیرہ کے متعلق گفتگو کی۔ اللہ تعالیٰ کو یہ عظیم الشان کار خیر اس بلند ہمت خاتون سے لینا تھا۔ محلہ خندریسہ میں جگہ خریدی گئی اور مدرسہ کی تعمیر شروع ہو گئی۔ اکثر صولت النساء صاحبہ مرحومہ خود تعمیر کا کام دیکھنے کے لیے تشریف لاتیں اور اپنی خوش قسمتی اور اس توفیقِ خدمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتیں۔ مدرسہ کے سب سے پہلے رجسٹر کی ابتدائی عبارت جو حضرت مولانا مرحوم کے قلم مبارک کی ہے نقل ذیل ہے:

"حمد اور نعت کے بعد یہ ہے کہ اگرچہ مدرسہ ہندیہ حضرات اہل ہند کی ہمت اور توجہ سے مکہ معظمہ ادام اللہ شرفہا میں سنہ بارہ سو نوے[۱۲۹۰] رمضان کے مہینے میں قائم ہوا تھا۔ پر اسباب چند در چند سے جو اس سنہ کے چار مہینوں میں کسی طرح کے ہرج پیش آئے، سو اس لحاظ سے ہم اُن چار مہینوں کو نظر سے گرا کے اس مدرسہ کے قیام کو محرم الحرام بارہ سو اکانوے[۱۲۹۱] گنتے ہیں اور سب امور متعلقہ اس مدرسہ کو اسی سال سے لیتے ہیں۔ اللہ خیر سے ان امور کو انجام دیجو۔ بمنہ وکرمہ۔

۱۴ شعبان ۱۲۹۱ھ روز چہارشنبہ میں مدرسہ صولتیہ جدیدہ میں سب مدرسوں اور طالب علموں کو لایا گیا۔ یکم شعبان ۱۲۹۲ھ سے نواب محمود علی خاں بہادر والی چھتاری نے سو روپیہ ماہوار اس مدرسہ کے مقرر کر دیے۔"

ازل سے علم الٰہی میں یہ سعادت اور فخر اس بیوہ خاتون کے حصہ میں تھا اس لیے حضرت مولانا مرحوم نے ان کے اس ایثار کی بہتر یادگار کے طور پر مرکز اسلام کے اس اولین علمی ادارہ کا نام **مدرسۂ صولتیہ** رکھا جو قیامت تک اس کے نام کو عزت اور سچی ناموری کے ساتھ زندہ رکھے گا۔

حضرت بانی مدرسہ صولتیہ کو ابتدا میں علاوہ ان مشکلات کے جو اس قسم کے کاموں میں ہر ایک کام کرنے والے کو پیش آتی ہیں، دو نئے امر سد راہ ہوئے جن کا وہم وگمان بھی حضرت بانئ مدرسہ کو نہ تھا۔

۱۔ انگریزی کونسل متعینہ جدہ کو یہ خیال اور وہم پریشان کرتا رہا کہ حضرت مولانا مرحوم اس درس گاہ کے پس پردہ انگریزوں کے خلاف پروپیگنڈا اور کوئی باغیانہ سازش نہ کرتے ہوں۔ اس لیے کہ حضرت مولانا مرحوم پر ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں غیر وفاداری کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس وجہ سے مدرسہ کے قیام میں اس نے ہر ممکن رکاوٹ پیدا کرنے میں دریغ نہ کیا۔

۲۔ حجاز کے مقامی ترک حکام کو یہ اندیشہ دامن گیر رہا کہ زمین حرم پر مدرسہ کی ابتدا ہندوستان کے مسلمانوں کی کوشش سے ہو رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ درسگاہ آئندہ بیرونی اقتدار اور اغیار کی مداخلت کا کسی وقت میں ذریعہ بن جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ترکوں کی بدگمانی ایک حد تک درست تھی کیوں کہ وہ اپنے ملک میں مشن اور پادریوں کے خیراتی اور رفاہِ عام کے کاموں کا تلخ تجربہ اٹھا چکے تھے۔ باوجود ان تمام مشکلات اور زبردست مخالفت کے بانیٔ مدرسہ نے ہمت و پامردی کو ہاتھ سے نہ دیا اور ان کا مقابلہ کیا۔

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

کچھ زمانے کے بعد حقیقت حال اور اصلیت کی روشنی میں تمام شک وشبہات کے بادل چھٹ گئے، اور مولانا مرحوم نے اپنے خلوص و للہیت اور استقلال کی بدولت آئندہ کے لیے راستہ صاف کر لیا۔

مدرسہ کے اغراض ومقاصد:

سطور بالا سے معلوم ہو چکا ہے آج سے اسی سال قبل مکہ معظمہ کی تعلیمی حالت اور درس وتدریس کی رفتار کس قدر محدود تھی۔ حضرت مولانا مرحوم نے اپنی خداداد دوراندیشی اور حساس دل

و دماغ سے مدرسہ کے قیام کے بعد جو لائحہ عمل مرتب فرمایا اس میں ان تین اہم اغراض کو مقصدِ اولیں بتایا ہے:

۱۔ اسلامی دنیا سے مکہ معظمہ میں ہر سال شائقین علوم دینیہ کی ایک جماعت اس جذبہ اور ولولہ کے ساتھ آتی ہے کہ اسلام کے دینی مرکز میں تعلیم حاصل کرے اور اسلامی تہذیب و معاشرت کا گہرا مطالعہ کرنے کا قریب سے موقع ملے۔ ان آفاقی طلبہ کی تعلیم اور قیام وطعام کا اہتمام اور حتی الامکان ان کی ضروریات کا لحاظ رکھنا مدرسہ کا اہم فرض ہے۔

۲۔ مہاجرین حرم کی اولاد کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا تاکہ آوارہ گردی جہالت و بداخلاقی کے شکار نہ ہوں اور تعلیم و تربیت کے ساتھ ان کو شریف پیشے سکھائے جائیں تاکہ گداگری اور فقر و تنگدستی کی مصیبت سے ان کو نجات ملے اور خدا کے گھر میں دوسروں کے دست نگر نہ رہیں۔

۳۔ ہندوستان (قدیم) میں قرآن پاک کی صحیح قرأت کی اشاعت اور اس اعتراض کو اٹھانا کہ ہندوستانی حفاظ کلام اللہ کو غلط پڑھتے ہیں۔ مصر و حجاز وغیرہ ممالک اسلامیہ کے قرّاء اور حفاظ کی ہندوستانیوں پر یہ نکتہ چینی بیجا نہیں۔ اس کے ازالہ کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا۔

مدرسہ صولتیہ کا مسلک:

اغراض و مقاصد کے ساتھ حضرت بانیٔ مدرسہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایمانی فراست اور گرد و پیش کے تمام حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس عرفانی مرکز کے لیے کچھ ضروری اور اہم ہدایات مرتب فرمائیں۔ ان میں بالخصوص ان تین امور پر زیادہ اصرار کے ساتھ پابندی کی تاکید فرمائی۔

۱۔ قطعی طور پر سیاسیات اور سیاسی دلچسپیوں سے ہر کارکن و مدرس اور طالب علم کو بے تعلق رہنا ضروری ہے۔

۲۔ اختلافی امور اور مختلف فیہ مسائل سے کلی طور پر احتراز کیا جائے۔

۳۔ تفریق اور گروہ بندی سے ہر طرح بچنا چاہیے۔

حضرت مولانا مرحوم نے جس حکمت اور بالغ نظری سے ان امور کی پابندی کو لازمی قرار دیا اور ان کو مدرسہ کا مستقل مسلک معین فرمایا۔ حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ حضرت بانیٔ مدرسہ

رحمۃ اللہ علیہ کو یقیناً خداداد بصیرت حاصل تھی۔ پچاس سال پہلے حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم بانی دارالعلوم ندوۃ العلماء مدرسہ صولتیہ کی اس خصوصیت کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

"مدرسہ کی خوش نصیبی اور مولانا مرحوم کی نیک نیتی کا ایک عمدہ ثمرہ یہ ہے کہ اس کے تمام مدرسین اور طلبا، اس وقت کی آفتوں سے علیحدہ ہیں۔ ان کے خیالات میں نہ افراط و تفریط ہے اور نہ جدال و نزاع کا انھیں شوق ہے اور نہ کسی مسلمان کی تکفیر و تفسیق کا انھیں خیال ہے۔ الحمد للہ اس نازک اور پرفتنہ وقت میں اس بلا سے بچنا ہی خدا کا بڑا فضل ہے۔ وہ اس مدرسہ پر ہے۔"

قسطنطنیہ کا دوسرا سفر:

۱۲۹۹ھ میں عثمان نوری پاشا دولت عثمانیہ کی طرف سے حجاز کے گورنر (والی) مقرر کیے گئے، موصوف چونکہ فوجی آدمی تھے اس لیے حکمت عملی اور دوراندیشی ان میں نہ تھی۔ بعض خود غرض اور فتنہ انگیز لوگوں کی ریشہ دوانی سے وہ مدرسہ صولتیہ سے بدظن ہوئے اور اسے اجنبی ملک کی ایک تحریک سمجھ کر مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت مولانا مرحوم سے تعلقات کی کشیدگی نے معاملہ کو قسطنطنیہ تک پہنچا دیا، اور طرفین کے معروضات سلطان عبدالحمید خان کی بارگاہ میں پیش ہوئے یہ حضرت مولانا مرحوم کے دوسرے سفر قسطنطنیہ کی قدرتی تمہید تھی۔ عثمان نوری پاشا کے ارادوں اور خیالات کے برعکس قسطنطنیہ سے حضرت مولانا مرحوم کی طلبی کا حکم پہنچا اور حضرت مولانا شاہی مہمان کی حیثیت سے دارالخلافہ تشریف لے گئے۔

اثنائے قیام قسطنطنیہ میں متعدد بار حضرت مولانا مرحوم کو سلطان نے شرف باریابی بخشا اور مختلف مسائل و معاملات پر گفتگو ہوتی تھی۔ سلطان نے مدرسہ صولتیہ کے لیے معقول ماہانہ امداد مقرر کرنے کے متعلق خیال ظاہر فرمایا جس کے جواب میں شکریہ اور دعا کے بعد حضرت مولانا مرحوم نے سلطان کی خدمت میں عرض کیا کہ:

"حرمین شریفین میں امیر المومنین کے بہت سے جاری کردہ امور خیر ہیں اور بہت

سے نیک کام تشنۂ تکمیل، مدرسۂ صولتیہ چوں کہ ہندوستان (ہند اور پاکستان) کے دین دار اور نیک خیال مسلمانوں کی امداد سے چل رہا ہے اور قائم ہے ان کو اس کارِ خیر میں شرکت و سرپرستی کی سعادت سے محروم نہ فرمایا جائے جو یقیناً امیرالمومنین کے الطافِ شاہانہ سے بعید نہیں۔"

ایک ملاقات میں مولانا بدرالاسلام صاحب (حضرت مولانا مرحوم کے بھتیجے بھی ساتھ تھے۔ ان کے لیے سلطان نے حکم فرمایا کہ یہ میرے پاس رہیں گے اور کتب خانہ حمیدیہ (سلطان عبدالحمید خاں کا شاہی دارالکتب جو دنیا کے خاص کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے اور جس میں سلاطین آل عثمان کی تمام کتابوں کو جمع کیا گیا ہے)، قصر یلدز کا ان کو مہتمم بناتا ہوں۔ حضرت مولانا مرحوم نے اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کیا۔ اور مولانا بدرالاسلام صاحب اس خاص علمی خدمت پر مامور ہوئے۔ آخر وقت تک سلطان کے معتمد علیہ رہے۔ محاصرۂ قصر یلدز اور سلطان عبدالحمید کی معزولی کے پرخطر وقت میں صرف تین اشخاص سلطان کی خدمت میں باقی رہے جن میں مولانا بدرالاسلام بھی تھے۔

سلطان سے الوداعی ملاقات کے بعد دوسرے دن مصطفیٰ وہبی بے یاور اور خیرالدین پاشا اور نسیم بے اور سید احمد اسعد مدنی یہ چاروں اصحاب تشریف لائے اور سلطان کی طرف سے ذاتی ہدیہ ایک مرصع تلوار حضرت مولانا مرحوم کو دی اور سلطان کے یہ الفاظ نقل کیے کہ:

"ہتھیار ہر مجاہد فی سبیل اللہ کی زینت ہے۔"

قسطنطنیہ سے حضرت مولانا مرحوم مکۂ معظمہ پہنچے۔ مدرسہ صولتیہ کے لیے یہ مسرت اور خوشی کا دن تھا۔ یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ استقبال کرنے والوں میں حجاز کے گورنر "عثمان نوری پاشا" بھی تھے جو سب سے پہلے حضرت مولانا مرحوم سے بغل گیر ہوئے اور اپنی غلط فہمی کی معافی چاہی۔

نہرِ زبیدہ:

ملکۂ بغداد خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ خاتون کا دائمی صدقۂ جاریہ نہرِ زبیدہ

امتدادِ زمانہ سے بہت زیادہ قابلِ مرمت و اصلاح تھی اور پانی کے لیے ساکنانِ حرم کو کافی دقت و زحمت پیش آتی تھی۔ اسی زمانہ میں سیٹھ عبدالواحد عرف "واحد نا سیٹھ" مکہ معظمہ آئے اور اس سلسلہ میں ایک مشورتی اجتماع مدرسہ صولتیہ میں منعقد ہوا۔ سیٹھ عبدالواحد صاحب باتوفیق صاحب ہمت دولت مند تھے۔ حضرت مولانا مرحوم نے نہر زبیدہ کی از سرِ نو اصلاح و مرمت کا بیڑا اٹھایا، اور اس کے لیے حکومت کی اجازت و حالات کے لحاظ سے ایک مستقل مجلس قائم کی گئی جس میں مہاجرین مکہ معظمہ کے ہر طبقہ میں سے ہر قوم کے ممتاز افراد مجلس میں ممبر بنائے گئے۔ اس مجلس کی صدارت کے لیے حضرت مولانا مرحوم کو منتخب کیا گیا مگر آپ نے اپنے شاگرد رشید فضیلت مآب مولانا شیخ عبدالرحمٰن سراج صاحب مرحوم مفتی احناف و شیخ العلماء مکہ معظمہ کو اس کے لیے موزوں سمجھا اور خود نائب صدر کی حیثیت سے اس عظیم الشان کام کی ذمہ داری اٹھائی۔ سیٹھ عبدالواحد صاحب نہر زبیدہ کے خزانچی اور تحویل دار مقرر ہوئے۔ خدا کا شکر و احسان ہے کہ یہ صدقۂ جاریہ ان بزرگوں کی ہمت سے دوبارہ زندہ ہوا۔

قسطنطنیہ کا تیسرا سفر:

دوسرے سفر سے واپسی کے بعد دیگر مشاغل و مصروفیات کے ساتھ خیرالدین پاشا، علی بے اور شیخ الاسلام وغیرہ مقربین سلطان و اعیان دولت سے حضرت مولانا مرحوم کی خط و کتابت کا سلسلہ رہا۔ اور اکثر براہِ راست سلطان معظم کو بھی بعض اہم امور کے متعلق خطوط تحریر فرماتے رہے۔ کبر سنی اور کثرت مشاغل کے سبب آپ کو ضعف بصر کی شکایت ہو گئی اور ۱۳۰۲ھ ہجری میں حضرت مولانا مرحوم نزول الماء (موتیا بند) کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے مجبور ہو گئے۔ سلطان کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فوراً حضرت مولانا مرحوم کو قسطنطنیہ طلب کیا۔ اس حالت میں یہ طویل سفر آپ کے لیے ناقابلِ برداشت تھا مگر سلطان کے حکم سے آپ نے عزمِ سفر کیا۔ رفقاء میں مولوی عبداللہ صاحب عرف عبداللہ جی شاگرد و خادم۔ حضرت مولانا مرحوم نے اس سفر کے جو ابتدائی حالات قلم بند کیے وہ درج ذیل ہیں:

"پورٹ سعید میں روز شنبہ ۷ شعبان ۱۳۰۲ھ استنبول کو دو تار روانہ کیے۔ ایک

بنام میاں عبدالاسلام صاحب کے اور ایک بنام علی بے کے۔ اور اسی تاریخ میں ایک
گنی عثمانی اور دو فرنگ خرچ ہوئے اور اسی روز قریب بعد عصر آگبوٹ (جہاز) بیروت سے
روانہ ہوا اور چہار شنبہ کی رات کو چاند رمضان شریف کا نظر آیا اور روز چہارشنبہ
پہلی رمضان مبارک بحساب ہماری رویت کے صبح کے وقت تین بجے "چناق قلعہ" میں
پہنچے اور وہاں کمندار (فوجی افسر اعلیٰ) تمام قلعوں چناق قلعہ کا آگبوٹ پر آیا اور مولوی صاحب
سے ملا اور کہا کہ: "سرائے (محل شاہی) سے حکم آیا ہے کہ مولوی رحمت اللہ صاحب
چناق قلعہ میں پہنچے یا نہیں، اس سے اطلاع دو۔ تو میں اس بات کے واسطے آپ کی خدمت
میں حاضر ہوا۔" اور بعد ایک ساعت کے پھر آگبوٹ چلا اور روز پنجشنبہ ۲ رمضان مبارک
سنہ ۱۲۹۰ھ استنبول میں پہنچے اور سرائے یلدیز (قصر یلدز) میں "چادر کشک" میں اترے
اور بعد ایک ساعت کے جناب سید احمد اسعد آفندی مدنی تشریف لائے اور کہا کہ:
"حضرت سلطان آپ کو بلاتے ہیں۔" تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک آغا (خواجہ سرا) آیا
تو جناب مولوی صاحب حضرت سلطان کے پاس تشریف لے گئے۔ حضرت سلطان بڑی
تعظیم سے پیش آئے اور بعد دو ساعت کے پھر جناب مولوی صاحب رخصت لے کے
مکان (چادر کشک) میں تشریف لائے۔ پھر قریب مغرب اسی روز پھر سید احمد اسعد
آفندی مدنی تشریف لائے اور کہا کہ: "حضرت سلطان بلاتے ہیں۔" تو مولوی صاحب
تشریف لے گئے اور وہیں افطار کیا اور تراویح بھی وہیں پڑھی۔ حضرت سلطان نے
اُس وقت فرمایا کہ آپ کی آنکھوں کے علاج کے واسطے کل میں ڈاکٹروں کو بھیج دوں گا۔
پھر وہاں سے مولوی صاحب مکان پر تشریف لائے اور روز جمعہ بعد عصر حضرت سلطان
نے اپنے ایک مصاحب کے ساتھ پانچ ڈاکٹروں عمدہ کو بھیجا۔ انھوں نے آ کے مولوی
صاحب کی آنکھوں کو خوب تحقیق سے دیکھا اور کہا کہ: "انشاء اللہ تعالیٰ آنکھیں اچھی
ہو جاویں گی پر علاج دو مہینے کے بعد کریں گے، کیوں کہ اب تک پانی آنکھوں میں
کامل نہیں اُترا۔" اور روز پنجشنبہ میں حاجی علی بے قرنائے ثانی بھی بعد ظہر
تشریف لائے اور انھوں نے مولوی صاحب سے ملاقات کر کے مولوی عبدالاسلام

سے کہا کہ مولوی صاحب کے واسطے کپڑے بازار سے لے آویں اور جا کے کپڑے بازار سے خریدے اور لیتے آئے، اور روز جمعہ نماز جمعہ جامع حمیدیہ میں پڑھی اور روز شنبہ ۵ رمضان مبارک بعد ظہر جناب عبد اللہ پاشا نجدی واسطے ملاقات جناب مولوی صاحب کے آئے اور روز دوشنبہ ۷ رمضان شیخ محمد ظافر مع اپنے بڑے بیٹے کے واسطے ملاقات کے تشریف لائے اور بعد اس کے اور چند بار حضرت سلطان نے بلایا اور ۱۵ رمضان روز سہ شنبہ زیارت چادر شریف میں جانے کے واسطے بگی محمد ذہبی اور سید احمد اسعد افندی کو بہ سبب ضعف بصر کے ساتھ کیا اور وہاں جائے زیارت میں اسحاق افندی اور اکثر قضاۃ عسکر ملے، اور ۳۰ رمضان کو جناب سید احمد اسعد کو حضرت سلطان نے مولوی صاحب کی خیریت دریافت کرنے کو بھیجا اور پہلی شوال روز چہار شنبہ کو ہوئی اور نماز عید کی جامع حمیدیہ میں پڑھی۔"

سلطان کی خواہش تھی کہ حضرت مولانا مرحوم قسطنطنیہ میں ان کے پاس رہیں۔ ایک صحبت میں سلطان نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا جس کے جواب میں حضرت مولانا مرحوم نے فرمایا کہ:

"اعزا اور اقارب کو چھوڑ کر ترک وطن کر کے خدا کی پناہ میں اس کے دروازے پر آکر پڑا ہوں۔ وہی لاج رکھنے والا ہے، آخری وقت میں امیر المومنین کے دروازے پر مروں تو قیامت کے دن کیا منہ دکھاؤں گا۔"

حضرت مولانا مرحوم کو قیام قسطنطنیہ بہت گراں اور شاق گزر رہا تھا اور عمر کے اس آخری دور کے ہر لمحہ کو وہ خدا کے گھر میں گزارنے کے خواہش مند تھے۔ اس زمانہ میں (سو برس پہلے) آپریشن ایک ہیبت ناک چیز تھی، اس لیے حضرت مولانا مرحوم شاہی اطبا سے آنکھ کے آپریشن کے لیے تیار نہ ہوئے۔ سلطان کو آپ کی از حد دلداری مقصود تھی اس لیے مرضی کے خلاف اصرار نہیں کیا اور سلطان سے اجازت لے کر ذی قعدہ میں مکہ معظمہ تشریف لے آئے۔ بسنہ ۱۳۰۵ھ میں ایک مقامی معالج سے نزول الماء کا آپریشن مکہ معظمہ میں کرایا جو افسوس ہے کہ کامیاب ثابت نہ ہوا۔

حضرت مولانا مرحوم چوں کہ لاولد تھے اس لیے آپ نے اپنے بڑے بھائی مولانا حکیم علی اکبر صاحب مرحوم کے پوتے مولانا محمد سعید صاحب مرحوم کو وطن سے بلایا۔ ان کے والد مولوی محمد صدیق صاحب انبالہ میں سررشتہ دار تھے اور مکان کے قریب ایک مشن اسکول تھا جس میں منشی نہال الدین صاحب فارسی کے مدرس تھے۔ منشی نہال الدین صاحب اور مولوی محمد صدیق صاحب میں دوستانہ تعلقات کی بناپر مولوی محمد صدیق صاحب نے اپنے لڑکے کو مشن اسکول میں داخل کردیا تھا۔ اس کی اطلاع جب حضرت مولانا مرحوم کو ہوئی تو آپ نے رنج وملال کا اظہار فرمایا اور سختی کے ساتھ لکھا کہ "محمد سعید کو مشن اسکول سے نکال کر فوراً مکہ معظمہ بھیج دیا جائے۔" چنانچہ بارہ برس کی عمر میں مکہ معظمہ پہنچے اور حضرت مولانا مرحوم نے اپنے اہتمام ونگرانی میں ان کی تعلیم وتربیت کا نظم فرمایا۔ ضعفِ بصارت کے بعد خطوط کی تحریر کا کام ان کے ذمہ ہوا۔ دوسری طرف حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی خواہش پر بالعموم مغرب اور عشاء کے درمیان مولانا محمد سعید صاحب مرحوم حضرت حاجی صاحب کے خطوط وغیرہ سنانے اور ان کا جواب لکھنے کے لیے جاتے تھے اور اس طرح ان دونوں بزرگوں نے اپنی خاص نگرانی اور تربیت سے مرکزِ اسلام کی خدمت کے لیے آپ کو تیار کیا۔

عماراتِ مدرسہ :

سرزمین حرم پر حضرت مولانا مرحوم نے مدرسہ صولتیہ کی شکل میں جو دائمی کارِ خیر چھوڑا اس کی متعدد خصوصیات میں یہ امتیاز قابلِ ذکر ہے کہ اس کے پاس اپنی ذاتی متعدد عمارتیں ہیں اور مدرسہ کے تمام شعبے ان وسیع عمارتوں میں ہیں جو اسی مقصد کے لیے حضرت بانی علیہ الرحمۃ نے بنائی تھیں، آپ کے عہدِ مبارک میں مدرسہ کی اکثر عمارتیں مکمل اور تیار ہوئیں۔

۱۔ مدرسہ کی سب سے پہلی عمارت :

صولت النساء بیگم صاحبہ مرحومہ، رئیسہ کلکتہ کی اعانت و مالی امداد سے ۱۲۹۱ھ میں پہلی عمارت تیار ہوئی اور اس محسن خاتون کے نام سے اس عمارت کو موسوم کیا۔ اس اولین وسیع عمارت میں پانچ بڑے کمرے اور تین چھوٹے کمرے، وسیع صحن اور دیگر ضروریات ہیں۔

۲۔ مدرسہ کا دارالاقامہ (بورڈنگ):

دوسری مستقل عمارت ہے جو صوبہ بہار کے ایک عالی ہمت رئیس میر واجد حسین صاحب رئیس پٹنہ کی یادگار ہے۔ اس عمارت کی ابتدا ۱۲۹۳ھ میں ہوئی۔ مدرسہ کے اس دارالاقامہ میں پچاس طلبہ کے رہنے اور قیام کی گنجائش ہے جس کا کوئی معاوضہ وغیرہ کسی سے نہیں لیا جاتا۔

۳۔ مسجدِ مدرسہ:

مدرسہ کی مسجد تاریخی حیثیت کے علاوہ ہندوستانی طرزِ تعمیر کا واحد نمونہ ہے۔ صحن حرم میں زمزم کے قریب "سلطانی کتب خانہ" کی عمارت تھی۔ صحنِ حرم میں اس عمارت کی وجہ سے نماز کے اوقات میں حجاج کو خاص طور پر تکلیف اور زحمت ہوتی تھی۔ حجاز کے گورنر عثمان نوری پاشا نے وزارتِ اوقاف قسطنطنیہ کو اس طرف توجہ دلائی کہ کتب خانہ کی عمارت اگر صحنِ حرم سے اٹھا دی جائے تو زائرین اور حجاج کی آسانی اور سہولت کا باعث ہوگا۔ یہ درخواست سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کے حضور میں منظور ہوئی۔ کتابیں اور عمارت کا تمام سامان مسجد حرم سے ایک ملحقہ عمارت میں منتقل کیا گیا اور کتب خانہ کی عمارت گرادی گئی۔ منہدم عمارت کے سامان وغیرہ کے نیلام کا اعلان ہوا۔ اس خبر کو سن کر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ بے چین ہوئے کہ جو پتھر اور سامانِ عمارت جوارِ کعبہ اور صحنِ حرم میں رہا ہو نیلام کے بعد نہ معلوم کس جگہ اور کس مقام پر خریدنے والے استعمال کریں۔ حضرت مولانا مرحوم نے عثمان نوری پاشا سے اپنا خیال ظاہر کیا کہ اس سامان سے مدرسہ صولتیہ سے متعلق ایک مسجد بنوادی جائے جس کی ضرورت بھی ہے۔ اس تجویز سے حجاز کے گورنر نے اتفاق ظاہر کیا۔ ملبہ کی قیمت پندرہ سو روپیہ طے ہوئی اور یہ صحن حرم سے مدرسہ میں منتقل ہوا۔ ۱۳۰۱ھ میں اس یادگار زمانہ مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ مکہ مکرمہ کے معمار گنبدوں کے بنانے میں مہارت نہیں رکھتے تھے۔ مسجد کے تینوں گنبد پانی پت ضلع کرنال کے معماروں کی یادگار ہیں جو اس زمانہ میں فریضۂ حج ادا کرنے کی غرض سے مکہ معظمہ آئے تھے۔ مسجد کی عمارت ۱۳۰۳ھ میں مکمل ہوئی۔ ہرات کے ایک ذی علم اور خوش قلم و خوش کلام مہاجر جن کو حضرت مولانا مرحوم سے خلوص اور دلی تعلق تھا انھوں نے مسجد کا مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ لکھ کر اپنے ہاتھ سے محراب کی پیشانی پر

کندہ کیا:

بسکہ خوش منظر است ایں مسجد　　　ما رأی العین مثلہ الثانی
گشت تاریخ "خانۂ رحمت" ۱۲۰۴ھ　　　رحمۃ اللہ قل علی البانی

مکہ معظمہ میں حضرت مولانا مرحوم کے تلامذہ:

مسجد حرم میں حضرت مولانا مرحوم کا حلقۂ درس مرجع خواص و عوام تھا۔ مسجدِ حرم کی تدریس کے زمانہ میں اور مدرسہ صولتیہ کے ابتدائی دور میں آپ سے جن اصحاب کو شرف تلمذ حاصل ہوا، اس طویل فہرست میں سے چند ممتاز علمائے حرم کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ شریف حسین بن علی۔ سابق امیر مکہ و بانی حکومت ہاشمیہ
۲۔ شیخ احمد عبداللہ مرداد۔ شیخ الائمہ والخطباء مسجد حرم
۳۔ " عبدالرحمٰن سراج۔ مفتی احناف و شیخ العلماء مکہ معظمہ
۴۔ " امین محمد مرداد۔ نائب قاضی مکہ معظمہ
۵۔ " عبدالرحمٰن حسن عجیمی
۶۔ " عبداللہ الغمری۔ مدرس مسجد حرم
۷۔ " حسن عبدالقادر طیب۔ مدرس مسجد حرم
۸۔ " اسعد احمد دہان۔ قاضی مکہ معظمہ
۹۔ " عبدالرحمٰن احمد دہان۔ مدرس مسجد حرم و صدر مدرس مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ
۱۰۔ " حسن کاظم۔ مدرس مسجد حرم
۱۱۔ مولوی عبدالستار صاحب دہلوی۔ مدرس مسجد حرم
۱۲۔ شیخ عبداللہ احمد ابوالخیر۔ قاضی مکہ و مدرس مسجد حرم
۱۳۔ " عبدالحمید بخش فلکی۔
۱۴۔ سید حسن دحلان۔ مدرس مسجد حرم
۱۵۔ شیخ عبدالرحمٰن شیبی۔ کلید بردار خانہ کعبہ

۱۶۔ شیخ محمد حسین خیاط۔ بانی مدرسہ خیریہ مکہ معظمہ

۱۷۔ " عابد حسین مالکی۔ مفتی مالکیہ مکہ معظمہ

۱۸۔ احمد نجار مرحوم۔ قاضی طائف

۱۹۔ شیخ محمد حامد مرحوم۔ قاضی جدہ

۲۰۔ " محمد سعید بابصیل۔ مدرس مسجد حرم

۲۱۔ مولانا بدرالاسلام صاحب۔ مدرس مدرسہ صولتیہ و مہتمم کتب خانہ حمیدیہ قصر یلدز قسطنطنیہ

۲۲۔ شیخ عبداللہ زواوی مرحوم۔ مفتی شافعیہ۔ مکہ مکرمہ

۲۳۔ " حسب اللہ مرحوم۔ مدرس مسجد حرم

۲۴۔ " محمد علی زین العابدین مرحوم۔ مدرس مسجد حرم

۲۵۔ " صالح کمال مرحوم۔ مدرس مسجد حرم

۲۶۔ " محمد علی کمال مرحوم۔ مدرس بمکہ معظمہ

۲۷۔ " درویش عجیمی مرحوم۔ "

۲۸۔ " بکر رفیع مرحوم۔ مدرس مسجد حرم

۲۹۔ مولوی نذیر احمد صاحب بنگالی۔ مہاجر مکہ معظمہ

۳۰۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب۔ مہاجر مکہ معظمہ

۳۱۔ مولوی ضیاء الدین عبدالوہاب صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ باقیات الصالحات مدراس

۳۲۔ مولانا قاری عبداللہ صاحب صدر مدرس شعبۂ تجوید قرآن مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ

۳۳۔ شیخ القراء مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب الہ آبادی۔

۳۴۔ مولانا عبداللہ غازی صاحب مرحوم۔ مورخ مکہ معظمہ و مہتمم کتب خانہ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ

۳۵۔ " حکیم محمد اسمٰعیل نواب صاحب مرحوم۔ مکہ معظمہ کے مشہور طبیب و عالم

۳۶۔ " محمد سعید صاحب مرحوم۔ سابق ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ

۳۷۔ " عبداللہ سراج مرحوم۔ مفتی احناف و قاضی القضاۃ و وزیر اعظم حکومت ہاشمیہ (حجاز)

۳۸۔ " سلیمان حسب اللہ مرحوم۔ مدرس مسجد حرم

۳۹۔ مولوی عبدالخالق اسلام آبادی، بانیٔ مدرسہ اسلامیہ دارالفائزین مکہ معظمہ

۴۰۔ شیخ محمد صالح میمنی مرحوم۔ مورخ مکہ و از مقربین شریف عون امیر مکہ۔

حضرت مولانا مرحوم کے عہدِ مبارک کے بعد بھی آپ کی اس مرکزی درسگاہ سے الحمد للہ علمی فیض اور دینی خدمت کا سلسلہ جاری ہے۔ آج سے اسّی سال قبل فنِ تجوید و قرأت پر بہت کم توجہ کی جاتی تھی اور اسی لیے یہ قابلِ قدر فن برائے نام تھا یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہندوستان (پاکستان و ہند) کے طول و عرض میں جہاں کہیں فنِ تجوید کا سلسلہ اور قرأت سبعہ کا چرچا دکھائی دیتا ہے۔ یقیناً بالواسطہ یا بلا واسطہ وہ مدرسہ صولتیہ کا فیض ہے۔ مدرسہ صولتیہ کے تعلیم یافتہ طلبار جنھوں نے ہندوستان (قدیم) میں تجوید و قرأت کی ترقی و تعلیم میں خاص حصہ لیا ان میں خصوصیت کے ساتھ قرائے ذیل قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ مولوی قاری محمد سلیمان صاحب مرحوم بھوپال

۲۔ قاری سید حسن صاحب دجانہ ضلع رہتک

۳۔ قاری عبدالرحمٰن صاحب مرحوم احیاء العلوم الہ آباد

۴۔ " عبدالخالق صاحب مدرسہ تجوید القرآن سہارن پور

۵۔ " ابراہیم رشید صاحب خطیب مکہ مسجد حیدر آباد

۶۔ " عبدالوحید خاں صاحب مرحوم دارالعلوم دیوبند

۷۔ " عبدالمالک صاحب مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ

۸۔ " فیض عالم صاحب۔ گولڑا۔ راولپنڈی

۹۔ " محمود یار صاحب۔ بھوپال

۱۰۔ " مطیع اللہ صاحب ملتان

۱۱۔ " میران شاہ صاحب مرحوم معلم تجوید دارالعلوم ندوہ لکھنؤ

۱۲۔ مولانا قاری ضیاء الدین صاحب مہتمم مدرسہ باقیات الصالحات مدراس

۱۳۔ قاری حمید الدین صاحب بانی مدرسہ تجوید سنبھل ضلع مراد آباد

۱۴۔ مولوی قاری سید مرتضیٰ حسینی صاحب بمبئی۔

ان مشاہیر قرّاء کے علاوہ "رحمت اللہ" کے اس فیض عام سے جو عظیم الشان دینی اور علمی فوائد حاصل ہوئے ان کے اسّی سالہ مفصّل تذکرہ کی ان محدود صفحات میں گنجائش نہیں۔" دارالعلوم حرم صولتیہ" کے ابنائے قدیم کی فہرست بے حد طویل ہے۔

وفات حسرت آیات:

اسلام اور مسلمانوں کی دینی اور علمی ہر ممکن خدمت کے بعد اس مجاہد فی سبیل اللہ نے ۷۵ سال کی عمر میں جمعہ کے روز ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اسلام کا یہ سچا خادم اپنی تمنا اور آرزو کے مطابق پیوند زمین حرم محترم ہوا۔ جنت المعلاۃ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے جوار اور صدیقین و شہداء کے زمرہ میں مدفون ہوئے۔

رحمۃ اللہ علی رحمت اللہ

اس چھوٹے سے احاطہ میں صرف چند قبریں ہیں جن میں اکثر و بیشتر اسی طبقہ کے خاصانِ خدا، عالم آخرت میں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ محض تاریخی معلومات کے لیے ان بزرگوں کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب (۲) حضرت حاجی امداد اللہ صاحب (۳) نواب عبدالعلی خاں صاحب رئیس چھتاری ضلع بلند شہر (۴) شمس العلماء مولانا محمد حسین صاحب الٰہ آبادی کے والد (۵) مولانا عبدالحق صاحب شیخ الدلائل، مصنف "اکلیل شرح مدارک التنزیل" (۶) مولوی عزیز بخش صاحب مرحوم بدایونی (۷) مولانا حضرت نور صاحب صدر مدرس مدرسہ صولتیہ (۸) مولوی عبداللہ غازی صاحب سابق مہتمم کتب خانہ مدرسہ صولتیہ و شاگرد حضرت مولانا مرحوم (۹) شیخ عبدالحکیم صاحب سابق خزانچی مدرسہ (۱۰) مولانا حبیب اللہ صاحب لاہوری فرزند حضرت مولانا احمد علی صاحب شیخ التفسیر۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

مولانا محمد مسعود شمیم کیرانوی
ناظم مدرسہ صولتیہ۔ مکہ مکرمہ

مکہ معظمہ کی علمی تاریخ کا ایک روشن باب

مدرسہ صولتیہ

اطرافِ عالم اور خاص طور پر حجازِ مقدس کی علمی تاریخ میں مدرسہ صولتیہ اور اس کے بانی حضرتِ اقدس مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کا نامِ نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ لیکن مدرسہ صولتیہ کی وجہ تسمیہ کیا ہے اور حضرت بانیٔ مدرسہ نے اس کو صولتیہ کے نام سے کیوں موسوم کیا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے دوران عیسائیوں کے ساتھ فیصلہ کن مناظروں کے بعد جب انگریزی تسلط و اقتدار نے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کو ہندوستان میں اپنی راہ کا کانٹا سمجھا تو آپ نے بیت اللہ کا رخ کیا۔ بظاہر یہ جلاوطنی اور آزمائش کی ایک صورت تھی لیکن کسے معلوم تھا کہ بے وطنی کی یہ اُفتاد اپنے اندر ایک نئی درخشاں تاریخ کے دروازے کھولنے والی ہے اور وہ بھی ایسی مقدس جگہ پر کہ جس کی عظمت کا روئے زمین پر کوئی مثیل نہیں۔

بے سروسامانی کی حالت میں مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اپنے تعمیری و اصلاحی ذہن و فکر سے بہت جلد یہ حقیقت مشاہدہ فرمائی کہ مکہ معظمہ میں باقاعدہ تعلیم کا نہ کوئی معیار ہے نہ کوئی مرکز، جس کا دل چاہے پڑھے نہ دل چاہے نہ پڑھے۔ علماء کرام کے حلقہ ہائے درس سے کماحقہٗ، وہ نتائج نہیں پیدا ہو رہے تھے جو اس مقام کے شایانِ شان تھے۔ چنانچہ چند روز بعد اس اجنبی ماحول میں رب العالمین کی طرف سے حالات سازگار ہوتے ہی آپ نے سب سے پہلے مسجدِ حرم محترم میں کعبہ معظمہ کے سامنے مقام حنفی سے متصل ماہ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ میں مدرسہ ہندیہ کے نام سے ایک دینی مدرسہ کا آغاز فرمایا۔

اہلِ حرم نے منظم تعلیم دیکھی، نیا طریقۂ تدریس دیکھا، نئی کتابیں دیکھیں تو پروانہ وار اپنی اولاد اور بچوں کو تعلیم کے لیے لانے لگے۔ مگر مسجد حرم کا ماحول تعلیم کی سازگاری اور انضباط کے لیے نامناسب تھا۔ کسی مقصد کی بنیاد خلوص وللٰہیت پر ہو تو قدرت خود کارساز ہوتی ہے۔ مہاجرینِ حرم کے طبقۂ خواص میں دناؤلی ضلع علی گڑھ کے نواب فیض احمد خاں صاحب مرحوم حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی قربانیوں اور مقام سے بخوبی واقف تھے اور روزانہ شریکِ درس ہوا کرتے تھے۔ مدرسہ کے لیے جگہ کا مسئلہ اٹھا تو انھوں نے اپنے عالیشان مکان کی پہلی منزل پیش کردی۔ اس طرح ابتدائی اسباق کے اور قرآن کریم کے طلبہ نواب صاحب کے مکان میں منتقل ہوگئے، اور بڑی کتابوں والے طلبہ حرم محترم میں مصروفِ تعلیم رہے۔ لیکن یہ نظم ہر طرح عارضی تھا اور حضرت مولانا بارگاہِ الٰہی میں مصروفِ دعا تھے کہ کس طرح مدرسہ کی مستقل و منظم تعمیری صورت ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا اور ۱۲۸۹ھ کے حج میں نواحی کلکتہ کی ایک صاحبِ خیر خاتون صولۃ النساء بیگم مکہ معظمہ میں کسی کارِ خیر کا جذبہ ساتھ لائیں۔ ہندوستان میں حضرت مولانا کے مجاہدانہ کارناموں سے واقف تھیں۔ چنانچہ پہلی فرصت میں اپنے داماد حکیم نوازش حسین صاحب مرحوم کے ذریعے حضرت مولانا سے مشورہ چاہا۔ قدرت کی طرف سے یہ سعادت اس پاک طینت خاتون کے حصّہ میں لکھی جا چکی تھی۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ: "مکہ معظمہ میں کوئی مدرسہ نہیں ہے۔" رات کو طوافِ کعبہ کے بعد دعا کی اور دوسرے دن اس کارِ خیر کی رقم جو ہندوستان سے ساتھ لائی تھیں مدرسہ کے لیے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی خدمت میں پیش کردی۔ آپ نے فوراً منتخب اہل الرائے کے مشورہ اور صواب دید سے جگہ اور عمارت کا انتخاب فرمایا۔ اپنے مدرسہ ہندیہ کے طلبہ و مدرسین کو نئی عمارت میں منتقل کرنے کے بعد اس کا نام "مدرسہ صولتیہ" رکھا۔ آج تک صولت النساء بیگمؒ کا تعارف اور سوانحی تذکرہ تشنۂ تکمیل تھا۔ قدرت کے ہاں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے حالات و کارناموں کے ضمن میں حرم محترم کی تاریخِ علم کا یہ قیمتی تذکرہ شائع کیا جا رہا ہے جو انشاء اللہ آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اور اسی کے

ساتھ یہ بھی گزارش ہے کہ اگر کسی صاحب کے پاس اس سلسلہ کی معلومات یا کوئی قدیم تاریخی یادداشت ہو تو اس سے ناظم مدرسہ کو مطلع فرمائیں۔

صولت النساء بیگمؒ:

کسے معلوم تھا کہ بنگال کے ضلع چوبیس پرگنہ کے ایک غیر معروف و نامانوس گاؤں بھیلہ سے ایک ایسی ہستی پیدا ہوگی جس کا فیض روئے زمین کے مقدس ترین خطہ سے اطرافِ عالم میں جاری وساری ہوگا، اور ہزاروں تشنگانِ علم اس سے معارف اسلامیہ اور علوم محمدیہ کی دولت لے کر اطرافِ عالم کو سیراب کریں گے اس کا نام سورج کی روشنی اور چاند کی ٹھنڈک کا مصداق ہوگا مگر قدرت کے کام نرالے ہیں وہ جس کو چاہے نواز دے جس کو چاہے محروم کر دے۔ قدرت کا یہ دستور انسانی فکر و فہم سے بالاتر ہے۔ کلکتہ سے جنوبی مشرقی سمت تقریباً اٹھارہ میل کے فاصلہ پر بھیلہ نامی گاؤں یا آبادی ہے جس کے متعلق وہاں کے لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ کسی زمانہ میں حضرت شاہ وسیلۃ اللہؒ نامی کوئی بزرگ وہاں آباد ہوئے اور چوں کہ اس جگہ کا کوئی نام نہیں تھا اس لیے ان کے زہد و تقدس اور صلاح و تقویٰ سے متاثر ہو کر ان کے نام نامی پر اس آبادی کا نام پڑ گیا جو امتدادِ زمانہ اور تلفظ بگڑنے کی بنا پر وسیلۃ اللہ سے بھیلہ ہو گیا۔ انگریزوں کے زمانے میں سرکاری کاغذات میں اس کو BHASELAH لکھا جاتا تھا جو اب تک رائج ہے۔ اُسی آبادی میں حضرت شاہ وسیلۃ اللہؒ کی نسل و اولاد میں ایک صدیقی خاندان کے عابد و زاہد اور نیک نام و نیک سیرت مولوی اجابت حسین صاحبؒ تھے۔ قدرت نے دنیاوی اسباب و وسائل سے بھی خوب نوازا تھا۔ مولوی اجابت حسین صاحب کے ہاں سب سے پہلے ایک فرزند عبد الصمد نامی تولد ہوئے اور ان کے بعد چھ لڑکیوں کی پیدائش ہوئی اور جب ساتویں دختر کی ولادت ہوئی تو بے حد کبیدہ خاطر ہوئے اور اس عطیہ ربانی کو ایک نظر دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوئے۔ ساتویں دن عقیقہ کے روز اعزہ و اقارب کے اصرار پر ساتویں بیٹی کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے اور بے اختیار سینے سے لگا لیا کہ اپنی سب بہنوں میں

بے حد حسین و جمیل اور معصوم صورت تھیں۔ سات دن کی بچی کے چہرے پر جلال و جمال کا معصوم امتزاج سب کو متحیر کیے ہوئے تھا۔ باپ نے بے اختیار دو رکعت نماز پڑھ کر سجدۂ شکر ادا کیا۔ اور شاید اس وقت راضی برضا ہونے کی یہ ادا قدرت کو پسند آگئی، اور باپ کی دعا اور سجدۂ شکر نے اس معصوم بچی کے لیے دنیاوی و اخروی سعادتوں کے فیصلے کروا لیے۔ اس باسعادت دختر کی ولادت ۱۸۲۲ء میں ہوئی اور باپ کی زبان سے الہامی نام صولت النساء بیگم تجویز ہوا۔ اُس وقت کے مروجہ طریقوں کے ساتھ ان کو قرآن پاک اور علوم دینیہ سے وافر حصہ پڑھایا۔ ان کی چھ بہنوں کی شادیاں متوسط گھرانوں میں ہوئیں لیکن صولت النساء بیگم کی شادی منشی لطافت حسین سے ہوئی جو کلکتہ، بلیاگھاٹ اور چوبیس پرگنہ کے بڑے زمیندار اور صاحب حیثیت اور صاحب خیر تھے۔ شادی کے بعد منشی لطافت حسین صاحب کی قسمت اور چمکی۔ جاہ و ثروت میں دن بدن ترقی ہونے لگی۔ ان کے شوہر نے جب صولت النساء بیگم کا محبت و خلوص، انتظامی قابلیت اور امور خیر سے دلچسپی کے مظاہر دیکھے تو ۱۸۵۲ء میں اپنی پوری جائداد ان کے نام منتقل کر دی اور اس کے ایک ہی سال بعد ۱۸۵۳ء میں انتقال فرما گئے۔ جس کے بعد صولت النساء بیگم نے اپنے بڑے بھائی مولوی عبدالصمد صاحب عرف مانک میاں اور اپنی دو بہنوں کے صاحبزادوں منشی منظر حسین اور منشی مبارک حسین کے ذمہ جائداد کی دیکھ بھال کا کام سپرد کیا اور خاوند کی یادگار میں ایک سڑک "منشی لطافت حسین روڈ" تعمیر کرائی جو آج تک اسی نام سے کلکتہ میں موجود ہے۔

اپنے قابلِ فخر اور محبوب شوہر کی وفات کے بعد صولت النساء بیگم کی توجہ امورِ خیر کی طرف اور زیادہ بڑھ گئی، اور اسی جذبہ کے ماتحت انھوں نے ۱۲۸۹ھ میں اپنے داماد حکیم نوازش حسین صاحب مرحوم اور دیگر اعزّہ کے ساتھ حج کا ارادہ کیا۔ اور یہ نیک عزم اور پاک ارادہ لے کر چلیں کہ اب مکہ معظمہ میں بھی کوئی مسافر خانہ تعمیر کریں گی یا ٹھنڈے پانی کی سبیلیں جاری کرائیں گی لیکن قدرتِ خداوندی ان کے حصہ میں ایسا کارِ خیر لکھ چکی تھی جو ان کے بلند عزائم اور پُرخلوص ارادوں سے کہیں زیادہ پاک و مقدس اور مقبول بارگاہِ الٰہی تھا۔

ہندوستان میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے حالات ایسے نہیں تھے کہ جن سے کوئی قومی و ملی درد و تعلق رکھنے والا بے خبر رہا ہو۔ خود بنگال کا علاقہ بھی بہت پہلے سے انگریزی سیاست کی زد میں آکر فرنگی اقتدار کا مرکز بن چکا تھا بلکہ ابتداء ہی سے ہوئی تھی جس کی بڑی دردناک اور سنگین قربانی نواب سراج الدولہ مرحوم دے چکے تھے۔ خاص طور پر عیسائی مشنریوں اور مسیحی طاقتوں کے ساتھ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم کے مناظروں نے تمام ہندوستان میں ہمہ گیر شہرت اختیار کر لی تھی جن سے صولت النساء بیگم بھی پوری طرح واقف و باخبر تھیں۔ چنانچہ مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد پہلی فرصت میں انھوں نے اپنے داماد حکیم نوازش حسین صاحب مرحوم کے ساتھ حرمِ پاک میں حضرت مولاناؒ کے درسِ بخاری کے بعد ملاقات کی اور مکہ معظمہ میں مسافر خانہ یا ٹھنڈے پانی کی سبیل کی تعمیر کے متعلق ارادے کا اظہار فرمایا۔ حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ "الحمد للہ مکہ معظمہ میں یہ دونوں کارِ خیر بہت زیادہ تعداد میں موجود ہیں مگر مدرسہ کوئی نہیں ہے جہاں اہلِ حرم کی اولاد اور مہاجرین کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا نظم ہو۔" کعبہ کے دروازہ پر طویل دعاؤں کے زیر اثر حضرت مولاناؒ کی زبان سے نکلے ہوئے یہ چند الفاظ اس پاک طینت خاتون کے دل میں اتر گئے اور یہ ابدی سعادت رحمت کے فرشتوں نے اس خاتون کے نام لکھ دی اور دوسرے دن پھر حرمِ پاک کے مبارک ماحول میں درسِ بخاری شریف کے بعد صولت النساء بیگم نے مدرسہ کے لیے خرید زمین و تعمیر وغیرہ کے لیے وہ رقم لاکر پیش کر دی جس کو ہندوستان سے کسی کارِ خیر کے لیے ساتھ لائی تھیں اور مدرسہ کے سب سے پہلے رجسٹر میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کے قلم مبارک سے لکھی ہوئی تحریر کے مطابق ۱۲ شعبان المعظم ۱۲۹۰ھ بروز چہار شنبہ تمام طلباء و مدرسین کو نئی عمارت میں لایا گیا، اور یہی دن مدرسہ کی تاسیس کا مقرر ہوا، اور حضرت بانیؒ کی ایک دوسری تحریر اس مضمون کی بھی درج رجسٹر ہے کہ تمام اسباق کی تنظیم اور باقاعدہ آغاز یکم رمضان المبارک ۱۲۹۱ھ کو ہوا۔ مکہ مکرمہ کی تاریخ میں چہار شنبہ ۱۲ شعبان المعظم ۱۲۹۰ھ کا یہ دن آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ اس سے پہلے سرزمینِ پاک پر کوئی مدرسہ نہیں تھا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے مدرسہ کے افتتاح کے لیے حرمِ محترم کے تمام علماء و مدرسین اور صلحاء و اتقیاء مکہ کو مدعو فرمایا۔ چنانچہ

مسجدِ حرم میں صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد سب حضرات مدرسہ میں آنے شروع ہو گئے۔ جو بھی آتا سب سے پہلے چار رکعت نماز اشراق ادا کر کے قرآن پاک اور سورۂ یٰسین کی تلاوت میں مشغول ہو جاتا۔ سب اکابر کی تشریف آوری کے بعد مدرسہ کے قاری جناب شیخ ابراہیم سعد مصری نے طلبہ کو قرآن کریم شروع کرایا۔ اس کے بعد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے بخاری شریف شروع فرمائی جس کے بعد شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے مثنوی شریف کے درس سے اس یومِ افتتاح کی برکتوں میں اضافہ فرمایا جس کے بعد طویل دُعا ہوئی، اور دُعا کے بعد تمام مہمانوں، شرکائے مجلس اور طلباء کو ناشتہ کرایا گیا۔

ذرا آنکھ بند کر کے عالمِ تصور میں اب سے ایک سو اٹھارہ سال قبل اپنے مدرسہ صولتیہ کے یومِ افتتاح و آغاز کی اس نورانی مجلس کا تصوّر کیجیے کہ مکہ معظمہ کے صلحاء و اتقیاء اور علمائے حرم کی موجودگی میں حضرت اقدس مجاہدِ اسلام مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ اور قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی سرپرستی میں قرآن کریم، بخاری شریف اور مثنوی کے اسباق سے آغاز ہوا۔ کیسے کیسے اہل اللہ، صاحبِ دل اور مسجد حرم کے ائمہ و خطباء، اور اس دورِ رحمت کے فرشتہ سیرت، پاک طینت، بزرگانِ دین اس مجلس میں جمع ہوں گے جن کی روحانی برکتوں اور دُعاؤں کے زیرِ سایہ باری تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ سلسلہ فیض و رحمت زمانہ کے گرم و سرد جھیلتا ہوا الحمد للہ سرگرمِ سفر ہے۔

ابھی سطورِ بالا میں قاری ابراہیم سعد صاحبؒ کا نام گزرا ہے۔ یہی وہ صاحبِ فیض ہستی ہیں جن کے دستِ مبارک پر مدرسہ کے عہدِ اوّل میں شیخ القرآء حضرت قاری عبداللہ صاحب مکیؒ اور ان کے بھائی حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب الہ آبادی جیسی عظیم ہستیوں نے قرآن و تجوید کی دولت حاصل کر کے اس کو مشرق و مغرب میں پھیلایا۔ قاری ابراہیم سعد مصر کے باشندہ تھے۔ نہایت عابد، زاہد اور قرآن پاک کے عاشق تھے۔ کعبہ کے زیرِ سایہ خدمتِ قرآن کے پاک جذبہ کے ماتحت اپنے وطن سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ آ گئے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کے درسِ بخاری میں آ کر بیٹھنے لگے تو پھر حضرت ہی کے ہو کر رہ گئے اور ان کے مدرسہ میں بچوں کو قرآن پڑھانے پر مامور کیے گئے اور آخر دم تک مدرسہ

سے وابستہ رہے۔

بارگاہ رب العزت میں صولت النساء بیگم کے خلوص کی قبولیت اور سچے تعلق کے ثبوت کے لیے یہ ایمان پرور روحانی قصہ بھی سنتے چلیے کہ مدرسہ کے لیے خرید زمین و تکمیلِ عمارت میں جس قدر رقم صولت النساء بیگم کے پاس تھی وہ صرف ہو چکی مگر عمارت میں پانی کے اسٹور یا مخزن کی تعمیر نہیں ہوئی تھی اور مکہ معظمہ میں اس وقت ہر محلہ یا علاقہ میں نہر زبیدہ کا پانی ہر گھر تک نہیں پہنچتا تھا بلکہ محلّوں میں قدیم طرز کے سقایہ تھے جن کو ترکی زبان میں بازان کہا جاتا تھا جن سے سقے اور اہلِ محلہ مشکوں اور کنستروں کے ذریعے گھر گھر پانی پہنچاتے تھے۔ اس لیے ہر گھر میں پانی کے لیے زمین دوز مخزن بنائے جاتے تھے جن میں بارش کا پانی محفوظ کرنے کا انتظام اس طرح کیا جاتا کہ چھتوں کو پختہ بنوا کر دیواروں میں مخفی نالیاں زمین دوز مخزن تک پہنچائی جاتی تھی تاکہ بارش کا پانی از خود چھتوں سے جمع ہو کر آتا رہے۔ پانی کا مخزن دراصل مدرسہ میں تیار نہیں ہوا تھا اور یہی کام باقی تھا کہ سابقہ رقم ختم ہو گئی۔ دوسرے دن صولت النساء بیگم صاحبہ نے خواب میں دیکھا کہ ان کو جنت الفردوس میں ایک نہایت عالی شان محل عطا ہوا ہے جس کو دیکھ کر وہ بے انتہا مسرور ہو رہی ہیں مگر اسی کے ساتھ خود شدید پیاس محسوس کر کے پانی تلاش کر رہی ہیں مگر اس میں کوئی سقایہ یا حمام وغیرہ کا نظم پانی کے لیے نہیں ہے اور نہ ہی پانی کہیں نظر آتا ہے اور شدّتِ پیاس سے ان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ صبح کی نماز کے بعد صولت النساء بیگم بہ عجلت اپنے داماد کے ساتھ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور خواب بیان کر کے جو روپیہ واپسی سفر کے اخراجات کے لیے ساتھ تھا وہ سب دے کر التجا کی کہ بہت جلد مدرسہ میں طلبہ و مدرسین کے لیے وضو خانہ اور پانی کے مخزن کی تعمیر کرائی جائے۔ چنانچہ اس خواب سے بے حد خوش تھیں اور بار بار کہتی تھیں کہ انشاء اللہ یہ قبولیت کی علامت ہے۔ جب تک حیات رہیں ماہانہ پچاس روپیہ مدرسہ کو مزید اس تاکید کے ساتھ دیتی رہیں کہ اہلِ مدرسہ کو پانی کی تکلیف نہ ہو۔

ایمانی احساس و شعور رکھنے والے دل اور خدمتِ دین کے جذبہ اور سوز و درد سے معمور قلوب اس تذکرہ میں یقیناً ایک روحانی سوز و گداز پائیں گے۔ خلوصِ نیت اور زہد

وتقویٰ کا یہ بلند مقام بھی جبینِ عقیدت کو خم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اس کو کوئی اور نام دینے یا اپنی طرف منسوب کرنے کے بجائے اصل محسنہ کے نام سے موسوم کیا۔ یہ ہے آپ کے مدرسہ صولتیہ کی وجہ تسمیہ اور اولین تاریخ کے چند نقوش۔

صولت النساء بیگم صاحبہ مرحومہ نے حج سے واپسی کے بعد اپنے وطن بھیلا ضلع چوبیس پرگنہ بنگال میں بھی ایک مدرسہ "صولتیہ" کے نام سے قائم کیا اور اس کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ ان دونوں امورِ خیر کے اخراجات کے لیے معقول جائداد وقف کی اور اپنے بڑے بھائی الحاج مولوی منشی عبدالصمد صاحب کو ان دونوں کا متولی مقرر کیا، مگر مولوی عبدالصمد صاحب کی وفات کے بعد ان کے فرزند منشی محمد عبداللہ صاحب نے اس مدرسہ کو مڈل انگلش سرکاری اسکول بنا دیا جو کچھ عرصہ کے بعد سرکاری نگرانی میں جونیر ہائی اسکول ہوگیا اور اب تک مغربی بنگال کی حکومت کے زیر نگرانی سرکاری اسکولوں کی طرز پر باقی ہے۔ مختلف زمانوں میں اس مدرسہ کے صدر اور سرپرست جناب مولوی کفیل الدین صاحب اور مولانا عبدالرزاق صاحب وغیرہ ہوئے جو اس علاقہ کی مشہور شخصیت گزرے ہیں۔ جناب مولوی برکت صاحب، صوفی قاری محمد مستقیم صاحب جیسے مشہور اساتذہ اس سے وابستہ رہے اور بنگال کی مشہور علمی ہستی جناب مولانا محمد مسرت حسین صاحب نے بھی اس میں ۴۵ سال درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ مولانا مسرت حسین صاحب کے پوتے پروفیسر ڈاکٹر محمد شہید اللہ صاحب ایم۔اے۔بی۔ایل۔ ڈی لٹ پیرس صاحبِ علم وفضل اور متعدد اعلیٰ ڈگریوں کے حامل ہیں اور دنیا کے ممتاز ماہرینِ اَلسنہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دنیا کی اکیس زبانوں کے ماہر ہیں۔ ۱۳۷۵ھ ۱۹۵۵ء میں بغرضِ حج مکہ معظمہ آئے تو بہت اہتمام سے اکثر وبیشتر مدرسہ صولتیہ میں تشریف لاتے تھے اور کئی زبانوں میں گفتگو کرتے تھے۔

اپنے وطن میں متعدد امورِ خیر کے علاوہ صولت النساء بیگم صاحبہ نے کلکتہ میں اپنے عالی شان سکونتی مکان کے قریب ایک شاندار مسجد کے علاوہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے غریب طلبہ کے لیے ایک ہوسٹل بھی تعمیر کرایا اور اس ہوسٹل میں رہائش پذیر تمام طالب علموں کے اخراجات مقرر کیے۔ اسی طرح بنگال میں مسلمانوں میں دینی تعلیم اور عربی زبان کے رواج اور قرآن کریم

کی تدریس واشاعت کے لیے کئی کام کیے۔ علماء وطلباء کی بے حد قدر افزائی اور سرپرستی کی جس کے اثرات اب تک جاری وساری ہیں۔ مذکورہ بالا مسجد کے قریب انھوں نے باہر سے آنے والے مسافروں کے لیے ایک مفت مسافرخانہ تعمیر کرایا۔ رفاہِ عام کے ان تمام کاموں کے لیے اپنی جائداد وقف کی، جس کے سب سے پہلے متولی صولت النساء بیگم کے لائق فرزند الحاج مولوی محمد محسن صاحب تھے جن کے بعد ۱۹۳۰ء تک یہ تمام ادارے مرحوم کے پوتے جناب مولوی منشی محمد عیسیٰ صاحب کی زیرِ نگرانی عمدگی کے ساتھ چل رہے تھے۔

صولت النساء بیگم کو فیاضِ ازل نے سراپا خیر و برکت پیدا فرمایا تھا۔ بچپن ہی سے علماء، مشائخ اور بزرگانِ دین اور اہلِ قرآن سے عقیدت و تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا گھرانہ بزرگ ہستیوں کا گویا مستقل مرکز تھا۔ اس زمانہ کے مشہور صوفی بزرگ اور اہل اللہ حضرت شاہ محمد بہاء الدین شامی کی شہرت سن کر نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ کلکتہ بلا کر ان کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور ان سے بیعت ہوئیں۔ یہ بزرگ ترکی خلیفہ سلطان عبدالمجید مرحوم کے بھی مرشد تھے۔ صولت النساء بیگم کے امورِ خیر سے غرباء، فقراء، بیوگان و محتاج وغیرہ کی جو امداد اور پرورش ہوتی تھی اس کے سچے قصے اب تک زبان زدِ خواص وعوام ہیں۔ بہت سے عزیزوں کو انھوں نے اپنے خرچ سے حج کرایا۔ دوسرے یا تیسرے حج سے واپسی کے بعد جب بمبئی میں صولت النساء بیگم صاحبہ کے سب سے چھوٹے فرزند کا انتقال ہوا تو چالیسویں دن ایصالِ ثواب کے لیے بمبئی کے تمام ہی علماء اور بزرگوں اور کئی ہزار غرباء و مساکین کو مدعو کیا۔ حفاظِ قرآن اور بزرگانِ دین کو ایک ایک جلد قرآن کریم کے ساتھ نذرانہ کی معقول رقم ہدیہ دی۔ حج کے لیے جب بھی تشریف لے جاتیں تو حرمین شریفین میں جود وسخا اور امداد کی انتہا نہ رہتی۔ بہت سے حجاج کے اخراجات کا تکفل کرتیں۔ جنگِ بلقان کے موقع پر صولت النساء بیگم نے ترکی حکومت کو پندرہ ہزار روپیہ کی تھیلی پیش کی۔

صولت النساء بیگم کا خاندان علماء اور مشائخ کا خاندان ہے جو پورے بنگال میں پھیلا ہوا ہے۔ فرفرہ شریف ضلع ہوگلی کا مشہور و معروف علمی و روحانی خانوادہ صولت النساء بیگم کے بہت قریبی عزیز ہیں اور اس مبارک سلسلہ کے سابقہ بزرگ حضرت مولانا شاہ محمد عبدالحی

صاحبہ کی صولت النساء، مفتیٰ پھوپھی ہوتی تھیں۔ فرفرہ شریف ضلع ہوگلی میں حضرت مولانا الحاج شاہ ابوبکر صاحب صدیقی کا روحانی فیض پورے بنگال، آسام اور بنگلہ دیش پر محیط ہے اور آپ "مجدد وقت" کہلاتے ہیں۔ ان صوبوں میں آپ کے مریدین و معتقدین کی کوئی انتہا نہیں۔ آپ حضرت شاہ سید صوفی فتح محمد صاحب اویسی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں تھے۔

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق خیر سے بھرپور زندگی کے ۶۰ سال پورے کرنے کے بعد ماہ فروری سنہ ۱۹۱۱ء میں جمعہ کے مبارک دن صولت النساء بیگم نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور بلیا گھاٹ کلکتہ میں اپنی تعمیر کردہ مسجد کے احاطہ میں اپنے عزیز شوہر منشی لطافت حسین مرحوم کے برابر ابدی نیند سو رہی ہیں۔ صولت النساء بیگم صاحبہ مرحومہ کی تعمیر کردہ تمام مسجدیں اور عمارتیں الحمد للہ بدستور موجود ہیں۔ البتہ بلیا گھاٹ کلکتہ والی مسجد میں جہاں خود مدفون ہیں وہاں تقسیم ملک کے بعد مسلمان آبادی بتدریج کم ہونی شروع ہوئی تو مقامی ہندو اور بعد میں بنگلہ دیش سے آئے ہوئے شرنارتھی چاروں طرف آباد اور قابض ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک اس مسجد میں گنیش کی مورتی بھی رکھی رہی اور اس کی باقاعدہ پوجا ہوتی تھی، مگر اب مورتی ہٹا کر مسجد مقفل کر دی گئی ہے۔ اسی طرح صولت النساء بیگم کی خود مسکنہ عالی شان کوٹھی میں بھی ہندو آباد ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مسجد اور قبریں اب تک تو محفوظ ہیں۔

مدرسہ صولتیہ کے جائے وقوع اور عمارتوں کے متعلق ناظم اول حضرت مولانا محمد سعید صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اقتباس پر اس تاریخی تذکرہ کو ختم کرتا ہوں جو انھوں نے ۱۳۵۷ھ میں مدرسہ کی ایک تعارفی رپورٹ "ندائے عام" میں اپنے قلم سے شائع فرمایا۔

"مدرسہ صولتیہ کی عمارتیں جس جگہ واقع ہیں اس کا عہد جاہلیت سے قدیم تاریخی نام "خندریسہ" ہے اور عربی میں پرانی تند و تیز شراب کا نام خندریس ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہاں شراب کی بھٹیاں تھیں، اعلیٰ قسم کی دو آتشہ و سہ آتشہ شراب کے متلاشی یہاں پہنچتے تھے۔ میخانے آباد تھے اور جھومتے جھامتے مخموروں کے اس آبادی کی رونق تھی۔ لیکن اب الحمد للہ یہاں علوم نبویہ اور معارفِ الٰہیہ کی دو آتشہ

درسے آنکھ طرح بے حقیقت انتشار ان علم کو پلائی جا رہی ہے اور اب ہاتھوں میں جہاں
ساغر و پیمانے کتاب معرفت اور وہ مغز حقیقت ہے، جہاں دست نگر آتے تھے
اب وہاں جا جریں حرم کے مسموم ہے اور دنیائے اسلام کے تشنگان علم دین قرآن
وحدیث میں شبہک نظر آتے ہیں۔ مدرسہ کی چاروں عمارتیں مکہ معظمہ میں اسلام کی ان
تاریخی یادگاروں کے درمیان واقع ہیں جن سے ایک طرف جبل کعبہ وہ مقدس پہاڑ
ہے جس کے پتھروں سے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے کعبہ کی
تعمیر فرمائی۔ دوسری طرف جبل مروہ پہاڑ ہے جس پر اسلام کے عظیم المرتبت خلیفۂ ثانی
حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے کے بعد سب سے پہلے وحدہ
لاشریک لہ کے نام کی آواز بلند کی اور اپنے اسلام لانے کا اعلان فرمایا بلکہ گویا عالم
میں خدائے ذوالجلال کے لیے یہ پہلی آواز حق مکہ کے پہاڑوں میں گونجی تو کفار مکہ
کے دلوں میں زلزلہ آگیا۔ مدرسہ کی تیسری عمارت بورڈنگ (دارالطلبہ) سے متصل
وہ قطعۂ زمین ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت حضرت خدیجہ
رضی اللہ عنہا کے روپیہ سے خرید کر مسلمانوں کے لیے ان کی آخری آرام گاہ قبرستان
کے لیے وقف فرمایا تھا۔ جب عہد اوّل میں کفار قریش نے اسلام کے ان
سابقین اولین کو اپنے قبرستان میں دفن ہونے سے روک دیا تھا "مقبرہ نجیبیہ"
کے نام سے یہ بابرکت قطعہ زمین اب تک موجود ہے۔ سنہ ۱۳۱۰ھ تک یہاں اس میں تدفین
جاری تھی اور ایک صدی قبل کے اکثر و بیشتر صلحاء و اتقیاء اور اہل مکہ اس
قطعۂ زمین میں اپنا مدفن ہونے کے لیے عہد اول کے ان نفوس قدسیہ کے
قرب و پڑوس کے لیے متمنی رہتے تھے جو اسلام کے بالکل ابتدائی دور سے
اس میں مدفون ہیں ـــــ آپ کے مدرسہ صولتیہ کی عمارتیں اسلام کی ان پُرانوار
یادگاروں کے قریب ہیں جن کو بصارت سے نہیں بصیرت کی آنکھوں سے دیکھنے
ضرورت ہے۔"

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را   تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

اس ایمان افروز اور روحانی سوز و گداز سے لبریز تذکرۂ علم و عرفان کو پڑھ کر
کیا یہ کہنا بر محل نہ ہوگا کہ سرزمینِ پاک مکہ معظمہ میں اہلِ حرم کے لیے اب سے ایک ہزار ایک سو
سال قبل عظیم المرتبت خلیفۂ ہارون الرشید کی بیگم زبیدہ خاتون نے پانی کی شکل میں نہرِ زبیدہ جاری
کر کے تشنگانِ حرم کو سیراب کیا۔ بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے علمی پیاس بجھانے اور قلبی و روحانی
سیرابی کے لیے دوسری زبیدۂ وقت صولت النساء بیگم کا انتخاب فرمایا جن کے مالی عطیہ اور
مجاہدِ اعظم شیخِ وقت حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مسلسل قربانیوں
اور جاں فشانی کے نتیجہ میں مدرسہ صولتیہ کا فیض الحمد للہ ایک صدی سے زیادہ کے عرصہ میں
پورے عالمِ اسلام پر محیط ہے۔ ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ بروز جمعہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ
کے اس عالمِ فانی سے رحلت فرمانے کے بعد حضرت مولانا کے پوتے اور داماد مولانا محمد سعید صاحب
کیرانویؒ حضرت کے جانشین، مدرسہ کے ناظم و مہتمم اور شرعی متولّی مقرر کیے گئے اور حق تو یہ ہے
کہ اس مردِ مجاہد نے اپنے ۴۸ سالہ دورِ سعادت میں خدمت کا حق ادا کر دیا۔ آپ کے
دورِ نظامت کا سب سے بڑا کارنامہ مدرسہ کی جدید عالی شان سہ منزلہ عمارت ہے جس
میں الحمد للہ تقریباً پون صدی سے تمام علمی و تعلیمی اغراض و مقاصد پورے ہو رہے ہیں۔ ۱۳۵۶ھ
میں وفات کے بعد حرم محترم کی اس علمی و دینی خدمت کی سعادت حضرت مولانا محمد سلیم صاحبؒ کے
حصہ میں آئی اور اپنے اسلاف اور عظیم المرتبت اہلِ حق بزرگوں کے نقشِ قدم پر چل کر آپ نے
رب العالمین کی توفیق و تائید سے مدرسہ کے لیے جو بین الاقوامی مقام پیدا کیا وہ آج سب کے
سامنے ہے۔ پورے ۴۱ سال اس تاریخی امانت کی خدمت کے بعد اس جانشین اکابر نے بھی
۲ شعبان المعظم ۱۳۹۷ھ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا ـــ یہ بابرکت تاریخی معلومات بھی قابلِ ذکر ہیں کہ
۱۳۰۸ھ میں حضرت بانیٔ مدرسہؒ کی رحلت کے بعد اور ان کی ہدایت و وصیت کے مطابق شیخ المشائخ
حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ صولتیہ کے سرپرست مقرر فرمائے گئے۔

گزر جائیں گے اہلِ درد رہ جائے گی یاد ان کی
وفا کا درس جب ہوگا تو اُن کے ذکر پہ ہوگا

حکیم عبدالقوی دریابادی
اڈیٹر 'صدق جدید'

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ
اپنی تصنیف 'اعجازِ عیسوی' کی روشنی میں

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بانی مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کا نام نہ صرف اس حیثیت سے زندہ و تابندہ ہے کہ انھوں نے قلبِ اسلام حجاز کے مرکزی اور مقدس ترین شہر مکہ معظمہ میں دینی تعلیم کا ایک معیاری مدرسہ 'مدرسہ صولتیہ' کے نام سے قائم کر کے وہاں علوم دین کی تعلیم و تکمیل کا انتظام کر کے وہاں کی ایک کمی کو پورا کیا بلکہ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے زمانۂ قیام میں اور اس کے بعد عالم مہاجرت میں ان مسیحی مبلغین (مشنریوں) سے جو مسلمانوں کی متاعِ ایمانی پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے مختلف شکلوں میں مصروف تھے، مقابلہ خوب ڈٹ کر کیا، زبانی میدانِ مناظرہ میں ان دشمن اسلام پادریوں کے سرخیل پادری فنڈر سے بارہا بازی جیتی اور اس کے دلائل کو رد کر کے اسلام کا علم سربلند کیا اور اس سے بھی بڑھ کر اس کی مجموعہ اباطیل تصانیف جو اسلام کے رد اور مسیحیت کی نصرت میں لکھی گئی تھیں کے رد میں متعدد مدلل کتابیں لکھیں اور خود عیسائی مستند مصنفین و محققین کی کتابوں کے حوالہ سے مروجہ مسیحیت کو بے نقاب کیا۔ انگریزی زبان اور مغربی مضامین سے مکمل ناواقفیت کے باوجود دین متین کے اس قلمی مجاہد (جو اس سے قبل ہندوستان کی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جہاد بالسیف میں بھی سرگرم حصہ لے چکا تھا) نے اسلام کی تائید و حقانیت اور تثلیثی مسیحیت کی تردید میں دفتر کے دفتر تیار کر دیے ان میں سے ہر کتاب پڑھنے کے قابل اور اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی اپنے مضامین کے اعتبار سے اپنی تازگی و تاثیر میں جوں کی توں، اور اسلامی تبلیغ کے اہم کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہندوستان میں فرنگی (انگریزی) اقتدار میں مسلمانوں کو نہ صرف سیاسی لحاظ سے غلام بنایا جا رہا تھا بلکہ پادریوں کے ذریعہ ان کو دینِ اسلام سے برگشتہ کرنے کی منظم کوششیں حکومت کی سرپرستی میں جاری تھیں۔ علمی انداز سے جن معدودے چند افراد نے ان کوششوں کا مقابلہ

ظاہری بے سروسامانی اور فضا کی انتہائی ناموافقت کے باوجود ہمت سے کام لے کر کیا ان میں مولانا رحمت اللہ کا نام نامی سب سے بلند وارفع نظر آتا ہے، ان کے اس وقت کے رفقا میں ڈاکٹر وزیر خاں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے، کیوں کہ وہ انگریزی زبان سے بھی خوب واقف تھے اور اسی حیثیت سے وہ مولانا کے خصوصی رفیق ومعین کار تھے۔

ہندوستان کے متعدد مناظروں میں پادری فنڈر کو شکست فاش بلکہ شکست فاحش دینے کے بعد جب اس پادری نے ہندوستان سے فرار کے بعد دار الخلافت قسطنطنیہ (استانبول) پہنچ کر یہ جھوٹا دعوی کیا کہ وہ زمانۂ قیام ہندوستان میں اپنی تصانیف اور مسلمان علماء سے مناظرہ کرنے کے ذریعہ اسلام کو شکست دے کر عیسائیت کا فاتحانہ پرچم بلند کر چکا ہے تو اس وقت کے خلیفۃ المسلمین سلطان عبد العزیز خاں کو بڑا صدمہ ہوا اور انھوں نے مولانا رحمت اللہ مہاجر مکی کی اس سلسلہ میں شہرت سن کر ان کو قسطنطنیہ بلایا۔ پادری فنڈر آپ کی آمد کی خبر سنتے ہی قسطنطنیہ سے رفو چکر ہو گیا اور اسے پچھلی شکستوں کے پیش نظر مولانا سے مناظرہ کی ہمت پھر زندگی بھر نہ ہو سکی، خلیفہ کے دربار میں مولانا کی بڑی پذیرائی ہوئی وہیں آپ نے رد مسیحیت میں اپنی معرکۃ الآرا کتاب "اظہار الحق" بہت قلیل مدت میں تصنیف کر کے خلیفہ کی خدمت میں پیش کی۔

ان کی اس سلسلہ کی دوسری تصانیف جن میں سے بعض کی اشاعت کا سلسلہ اب تک جاری ہے، میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) ازالۃ الشکوک (۲) اظہار الحق (۳) اعجاز عیسوی (۴) معیار التحقیق۔

بعض تصانیف دوسرے موضوعات پر ہیں اور وہ بھی اپنے رنگ میں خوب ہیں۔ لیکن مولانا کا نام ان کی ان تصانیف کے باعث زندہ ہے جو انھوں نے مسیحیت مروجہ کی تردید میں لکھیں، ان کتابوں میں اظہار الحق سب سے زیادہ مشہور ہے، اس کے تراجم، ترکی، انگریزی، فرانسیسی اور گجراتی زبانوں میں ہو کر ہزاروں کی ہدایت یابی کا ذریعہ بن چکے ہیں، اس کتاب کا اردو ترجمہ "بائبل سے قرآن تک" کے نام سے طباعت وکتابت کی ظاہری خوبیوں سے مزین مع مولانا محمد تقی عثمانی کی شرح وتحقیق کے پاکستان سے شائع ہو کر بہت مقبول ہو چکا ہے۔

آگرہ میں مولانا مرحوم اور پادری فنڈر سے جو مناظرہ ہوا تھا اس کی روداد کتابی شکل میں

اس خاکسار نے تقریباً بارہ سال کی عمر میں بڑے شوق سے اس زمانہ میں پڑھی تھی جب کہ ہر چھپی ہوئی چیز کو بہشتی جنتری سے لے کر سیرۃ النبی شبلی تک یکساں دلچسپی وانہماک سے خواہ کتاب کا مضمون پوری طرح سمجھ میں نہ آئے پڑھتا تھا۔ اس کتاب (جس کا نام افسوس ہے کہ اب یاد نہیں) کے مطالعہ سے اسلام پر مسیحیوں کے اعتراضات اور ان کے جو مسکت وشافی جوابات مولانا کیرانوی نے دیے تھے وہ باوجود اس کے کہ یہ موضوع بالکل نیا تھا اور کتاب کا انداز تحریر نسبتاً پرانی اور کسی حد تک ثقیل اردو میں تھا میں نے بڑے شوق سے پڑھے اور یہ چیزیں پوری طرح ذہن میں راسخ ہو گئیں، اور اسی وقت سے یہ خوش فہمی اب تک قائم ہے کہ اگر کہیں کسی مسیحی مناظر سے سابقہ پڑا تو میں اس سے پوری طرح مقابلہ کر سکوں گا، اس مناظرہ کی روداد میں ڈاکٹر وزیر خاں کا نام بھی بار بار نظر سے گزرا اور وہ نام آج تک یاد ہے۔

مولانا کیرانوی کی گراں قدر تصانیف میں اعجاز عیسوی کو خاص درجہ حاصل ہے، اس میں مولانا نے موجودہ بائبل جس کی ترویج واشاعت میں عیسائی مبلغین دنیا کے ہر گوشہ میں ساعی نظر آتے ہیں اور اسے قرآن مجید کے مقابلہ میں پیش کرتے ہیں پر تفصیلی نظر ڈال کر اس میں وقتاً فوقتاً ہونے والی تحریفات کو ظاہر کیا ہے اور اس کتاب کے جدید ترین اڈیشن کے پیش لفظ میں مولانا محمد تقی عثمانی کی یہ رائے بالکل صحیح نظر آتی ہے:

> "اس میں انھوں نے تحریف بائبل پر سب سے زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بحث کی ہے اور اس لحاظ سے اس کتاب کی کوئی نظیر عربی فارسی یا اردو میں موجود نہیں ہے بلکہ انگریزی زبان کی بھی کسی کتاب میں اتنے استقصاء کے ساتھ بائبل کے تضادات غلطیوں اور تحریفات کا بیان میری نظر سے نہیں گزرا"

یہ کتاب عرصۂ دراز سے نایاب اور تقریباً ناپید تھی، خدا کا شکر ہے کہ حضرت کیرانوی کے نبیرہ مولانا محمد شمیم نے جو ان کے قائم کردہ اور عالمی شہرت والے مدرسہ صولتیہ کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے ساتھ خدمت حجاج پر بھی اپنے بزرگوں کی طرح سرگرم عمل رہتے ہیں، اس کتاب کی از سر نو اور پہلے سے بہتر طباعت واشاعت کا انتظام پاکستان میں کرایا اور اس کا نیا اڈیشن جو (۷۶۰) صفحات پر مشتمل ہے، چوں کہ مصنف کی عبارت امتداد زمانہ کے باعث ایک

حد تک متروک اور موجودہ اردو داں نسل کے لیے جو عربی و فارسی سے نسبتاً کم واقف ہے بہت مشکل ہو کر رہ گئی تھی اس کو آج کی مروجہ سلیس و عام فہم اردو میں منتقل کر دیا گیا ہے تاکہ اس کا نفع عام ہو سکے، اس اہم کام کو مولانا محمد تقی عثمانی نے بڑی محنت و خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے، اور ساتھ ہی مولانا کی اول الذکر اور مشہور ترین کتاب 'اظہار الحق' کے نئے اڈیشن پر مولانا عثمانی نے جو حواشی لکھے تھے ان میں کے وہ حواشی جو اس کتاب کے مضامین سے تعلق رکھتے ہیں ان کو بھی درج کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم کام یہ بھی کیا گیا ہے کہ مولانا نے بائبل کے جن نسخوں سے جو ان کے وقت میں رائج تھے جو عبارتیں نقل فرمائی تھیں وہ اب بہت فرسودہ اور قدیم ہو چکے تھے، اور اب ان کے جو جدید ترجمے شائع ہیں وہ قدیم اور مولانا کے پیش نظر نسخوں کے مقابلہ میں خاصے مختلف ہیں ان اختلافات کی بھی توضیح حواشی کے ذریعہ کر دی گئی ہے، تاکہ عہد حاضر کے مسیحی مناظرین کو اعتراض کا کوئی موقع نہ ہاتھ آسکے۔

مصنف نے جو پیش لفظ (یہ اصلاح ظاہر ہے بہت بعد کی ہے) یا تمہید تحریر فرمائی تھی اس میں اس کتاب کی تالیف کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریف کا مطلب واضح کیا گیا ہے اور بائبل کے ان تراجم کے حوالہ دیے گئے ہیں جن سے مولانا نے عبارتیں نقل کر کے بائبل میں ہونے والی تحریفات کی نشان دہی فرمائی ہے۔

بائبل عہد عتیق اور عہد جدید کے نام سے دو حصوں میں منقسم ہے، مولانا نے ان دونوں میں شامل جملہ کتب کے نام لکھ کر ان میں موجود تحریفات کی وضاحت کی ہے اور اس اختلاف کو بھی واضح کیا ہے کہ موجودہ تورات (عہد عتیق) کے زمانۂ تصنیف سے متعلق (اور یہود و نصاریٰ کے اس دعوے کو کہ کتاب پیدائش سے لے کر کتاب استثنار تک پانچوں کتابیں حضرت موسیٰ کی تصنیف ہیں (وحی الٰہی کے قرآنی تصور سے بالکل مختلف) لیکن یہ دعویٰ ان پانچوں کتابوں کے ہر ہر باب اور ان کے ہر ہر فقرے کے بارہ میں بالکل غلط ہے اس کو مولانا نے بڑی تفصیل سے ثابت کیا ہے۔

اسی طرح عہد جدید پر مشتمل کتب میں ایک وہ جن کی صحت مسیحیوں کے متقدم جمہور نے تسلیم کی ہے مثلاً انجیل متی، انجیل مرقس، انجیل یوحنا، انجیل لوقا، اور دوسری وہ کتابیں جن کی صحت کے بارے میں مسیحیوں میں اختلاف ہے پر مولانا نے تحقیقی نظر اختصار کے ساتھ ڈالی ہے اور ان کے مصنفین کے بارے میں جو اختلاف چلا آرہا ہے اس کو بتایا ہے اور ان کتب مذہبی کی تحقیق کے سلسلہ میں زمانۂ قدیم میں عیسائی علماء کی

جو مجلسیں مختلف مقامات پر ہوئیں اور ان میں متعدد کتب کو مشکوک و نامعتبر قرار دے کر خارج کر دیا تھا اور بعض نئی کتب کو واجب التسلیم قرار دیا تھا ان کی تفصیل درج کرنے کے بعد بتایا ہے کہ اس وقت موجودہ عیسائیوں کے اختلاف نے جو فیصلے ان کتب مذہبی کے استناد کے بارے میں کیے تھے ان کو رومن کیتھولک یہی اب تک صحیح مانتے ہیں لیکن بعد میں مارٹن لوتھر کے قائم کردہ فرقہ پروٹسٹنٹ نے ان میں سے اکثر کو تسلیم کرنے سے بالکل انکار کر دیا ہے۔

کتاب کی تیسری فصل میں ان مقدس سمجھی جانے والی کتب میں وقتاً فوقتاً جو تحریفات ہوئی ہیں ان کے اسباب تفصیل سے بتائے گئے ہیں۔ نمونہ کے طور پر تحریف کے ساتویں سبب کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:

"حواریوں کے زمانہ ہی سے ملحدوں اور بددیانت لوگوں کو کتب مقدسہ میں تحریف اور جعل سازی کا پورا پورا موقع میسر آ گیا، انھوں نے یہ سوچ کر کہ اچھے لوگ تو مصائب میں مبتلا ہونے کے سبب ان کی تحریف و جعل سازی کی طرف توجہ نہیں دے سکتے لہٰذا ہماری جعل سازی کامیاب رہے گی کتب مقدسہ میں تحریف و جعل سازی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہوگا، ۳۰۰ھ تک اس جعل سازی کا بازار خوب گرم رہا اور دسویں صدی میں تو جعل سازی کا کاروبار انتہائی عروج پر پہنچ گیا تھا۔" (صفحہ ۷۰، ۷۹)

کتاب کی فصل میں صفحہ ۹۰ سے صفحہ ۹۶ تک اس دعوے پر دلائل قائم کیے گئے ہیں کہ موجودہ تورات حضرت موسیٰ کی تصنیف نہیں اور اس دعوے کے اثبات میں موجودہ عبارتوں ہی سے دلائل فراہم کیے گئے ہیں، مثلاً کتاب گنتی کے باب ۱۲ کی آیت ۳ اس طرح ہے:

"اور موسیٰ روئے زمین کے سب آدمیوں سے زیادہ حلیم تھا۔"

اسپائی نوزا کا قول ہے کہ یہ جملہ اس بات کا غماز ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اس کتاب کے مصنف نہیں ہو سکتے کیونکہ متکبر سے متکبر انسان بھی اپنی تعریف میں ایسے الفاظ استعمال نہیں کیا کرتا چہ جائیکہ موسیٰ جیسا پیغمبر لہٰذا یہ کہنا اقرین قیاس ہے کہ اس کتاب کا مصنف موسیٰ علیہ السلام کا عقیدت مند کوئی دوسرا ہی شخص تھا۔

تورات میں تحریف اور اس میں مندرج اختلافات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد عہد جدید کی کتابوں پر بھی اسی محققانہ انداز میں مولانا نے روشنی ڈالی ہے اور ان میں پائی جانے والی تحریفات کو دلائل کے ساتھ پیش فرمایا ہے اور اس سلسلہ میں عیسائی علماء کے اعترافات جو اس سلسلہ میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں پیش کیے ہیں۔

اس موضوع کی فصل چہارم میں انبیاء اور حواریوں کے بارے میں عیسائیوں کے اقوال پیش کیے گئے ہیں جن کی رو سے ان کی تمام تحریریں الہامی نہیں قرار پاسکتی ہیں، اور یہ بھی بتایا ہے کہ انجیل کی تحریر، انجیل نویسوں کے سہو اور کوتاہیوں سے خالی نہیں، اور اکثر مقامات میں ان کی روایتوں میں اتنا شدید اختلاف ہے کہ دور از کار تاویلات سے بھی بمشکل کچھ توافق پیدا ہوتا ہے مثلاً وہ اختلاف جو عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے زمانہ کے باب میں اناجیل لوقا اور متی اور ان کے ترجموں میں پایا جاتا ہے۔

ایک فصل میں (صفحہ ۵۲ ہ) بتایا گیا ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک انبیاء گناہوں سے حتیٰ کہ سب سے بڑے گناہ شرک اور بت پرستی سے بھی معصوم نہ تھے، اور کرامت کا صدور اور روح القدس سے محض مستفیض ہونا نہ نبوت کی دلیل ہے اور نہ ایمان کی۔ اس سلسلہ میں ان مقدس کتب کے حوالہ سے حضرت سلیمان پر بت پرستی، حضرت لوط پر اپنی بیٹیوں سے حالت مدہوشی میں زنا، حضرت نوح پر شراب نوشی اور حضرت داؤد پر زنا وظلم اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب پر جھوٹ کے الزامات صاف لفظوں میں عائد کیے گئے ہیں اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ انبیاء تبلیغ دین میں بھی جھوٹ بولتے تھے۔

کتاب میں مشہور پادری فنڈر جس کا ذکر اوپر آچکا کی کتاب میزان الحق کے ایک باب کی تیسری فصل جس میں مسلمانوں (جن کے لیے پادری مذکور نے قصداً محمدیوں کا لفظ استعمال کیا ہے) کے ان دعووں کا جو وہ عیسائیوں کی تردید میں لاتے ہیں رد پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی مثلاً یہ دعویٰ کہ عیسائیوں کی کتب مقدسہ میں تحریف و تبدیلی ہوئی باطل ہے۔ مولانا کیرانوی نے عام مناظرین کی طرح تلخ و تند لہجہ اختیار کیے بغیر متانت و سنجیدگی سے ان مسیحی پادریوں کے تمام دلائل کے شافی اور مسکت جوابات دیے ہیں، مثلاً یہ دکھایا ہے کہ بائبل میں فلاں جگہ تاریخ میں تبدیلی پائی جاتی ہے اور فلاں جگہ مقامات کے نام میں فرق ملتا ہے، فلاں جگہ پوری آیت تبدیل شدہ نظر آتی ہے، اور فلاں جگہ گنتی میں فرق نظر آتا ہے۔

تحریف اناجیل کے جواب میں پادری صاحب نے تحریف قرآن کا جو انوکھا دعویٰ اپنی اس کتاب میں فرمایا ہے اور اس سلسلہ میں شیعہ فرقہ کے بعض مزعومات کو دلیل راہ بنایا ہے۔ مولانا نے اس کے الزامی اور تحقیقی دونوں طرح کے جوابات دے کر پادری صاحب کے سارے

دعووں کی عمارت بالکل منہدم کر کے رکھ دی ہے، اس سلسلہ میں مولانا نے شیعہ علمار کے بھی وہ اقوال درج کیے ہیں، جن سے قرآن کی حقانیت کا پورا ثبوت ملتا ہے۔

پادری صاحب نے قرآن کی کتابت میں سہوِ کاتب مختلف مقامات پر ثابت فرمانا چاہا ہے، مولانا نے اس کو ہر اعتبار سے عملاً ناممکن اور پادری صاحب کی خیال آرائی کو محض توہم ٹھہرایا ہے اور پادری صاحب کو چیلنج دیا ہے کہ وہ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں عبارت کے ایسے اختلاف کی نشان دہی کریں جس سے یہ شبہ پیدا ہوجائے کہ کون سی عبارت اصلی ہے اور کون سی اپنی طرف سے وضع کی گئی ہے (جیسا کہ مسیحیوں کی کتب مقدسہ میں کثرت سے نظر آتا ہے اور جسے خود مسیحی محققوں نے بھی تسلیم کیا ہے، تو ان کے اس قسم کے دعاوی سہوِ کاتب وغیرہ کو درست مانا جاسکتا ہے۔

خاتمہ کتاب میں عیسائی مذہب میں ہونے والے گوناگوں تغیرات جو ان کی کتب مقدسہ میں مسلسل تحریف کے نتیجہ میں ہوئے کو دکھایا گیا ہے کہ اصل مسیحی مذہب باقی نہیں ہے اور اس کی جگہ دین پولسی لے چکا ہے اور دین پولسی بھی (مسیحی فضلار کے بیانوں کے مطابق) کئی سو سال تک دجالوں اور بت پرستوں کے زیر اثر رہا اور مسیحیوں کی کتب مقدسہ اس مدت دراز تک انہیں دجالوں کے پاس رہیں، اس کے بعد مولانا نے آج کے عیسائیوں سے دردمندانہ خطاب کیا ہے کہ :

"بھلا اب تم کس لیے ایسے دین اور ایسی کتب کے حامی بنے ہوئے ہو۔ کیوں نہیں تم نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر ابدی نجات حاصل کر لیتے ہو؟"

آخر میں مولانا کی بڑی مؤثر مناجات درج ہے، یہ غالباً من وعن مولانا ہی کی عبارت میں ہے، اس کے چند تمہیدی جملے ملاحظہ ہوں :

"اے رب العالمین تو جو ساری چیزوں پر قادر ہے اور بنی آدم کے دلوں کو شیطان کے وساوس سے چھڑانے کی طاقت رکھتا ہے اپنے فضل و کرم سے عیسائیوں کو جو سچے دل سے اپنی نجات کے خواہاں ہیں راہ راست پر لا اور ان کو جو تعصب کی راہ سے دین محمدی کے دشمن ہو رہے ہیں تعصب سے چھڑا اور ان کو توفیق عنایت فرما کہ سچے دل سے تیری راہ تلاش کریں اور تیرے نبی آخرالزماں پر ایمان لاکر نجات ابدی اور حیات سرمدی پائیں۔" (صفحہ ۱۷۱)

پادری سی۔جی۔فنڈر

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے متعلق اردو اور عربی زبانوں میں بہت کافی تفصیلات ملتی ہیں۔ ان کی عربی کتاب 'اظہار الحق' رد عیسائیت پر انیسویں صدی میں لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے جامع، مستحکم، مدلل اور مبسوط کتاب ہے جس کا ترجمہ دنیا کی چھ زبانوں میں ہو چکا ہے اور جس نے علمی دنیا سے زبردست خراج عقیدت وصول کیا ہے۔

یہ کتاب پادری فنڈر (REV. C. G. PFANDER) کی کتاب 'میزان الحق' کے جواب میں لکھی گئی تھی جس نے اسلام کے خلاف کئی کتابیں لکھی تھیں اور مسلمانوں کو مناظرہ کے لیے چیلنج کیا کرتا تھا۔ اس کی تصنیفات اور متعدد مقامات پر مناظرہ کے چیلنج نے عام مسلمانوں میں خوف و ہراس کی ایک فضا پیدا کر دی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ اوّلاً فنڈر کو ہندوستان کی زمام حکومت پر قابض ہونے والی ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے کارندوں کی مکمل حمایت حاصل تھی اور دوئم یہ کہ اس وقت تک ہمارے علماء نے عام طور پر عیسائیت کے مطالعہ اور اس کے رد کی جانب پوری توجہ نہیں دی تھی۔ بہرحال اس مقالہ کا مقصد پادری فنڈر کی شخصیت پر روشنی ڈالنا ہے جس کا طلسم مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے بالآخر چکنا چور کر دیا تھا۔

پادری فنڈر ابتداءً دس یا بارہ سال تک جرمنی کے ایک عیسائی مبلغ کی حیثیت سے روس کے صوبہ جارجیا (GEORGIA) میں قلعہ شوش (SHUSHY) میں مقیم رہا؛ جہاں سے وہ اکثر ایران کا دورہ کیا کرتا تھا۔ ایک دو بار اس نے بغداد تک کا سفر بھی کیا تھا۔ ایران میں آمد و رفت کے نتیجہ میں اس نے فارسی زبان میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس کے علاوہ آرمینیا کے رہنے والے ایک مسلمان لڑکے کو جسے ڈاکوؤں نے پکڑ کر غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا تھا اس نے عیسائی بنا لیا تھا جس سے وہ اپنی فارسی انشا پردازی میں مدد لیا

کرتا تھا۔ ۱۸۳۶ء میں روسی حکومت کی غیر ملکیوں کے اخراج کی پالیسی کے زیر اثر اسے روس چھوڑنا پڑا اور ۱۸۳۹ء میں اس نے ہندوستان میں عیسائی مبلغ کی حیثیت سے کام کرنا شروع کردیا۔ ہندوستان آنے سے قبل اس نے اسلام کے رد میں 'میزان الحق' تصنیف کرلی تھی جس میں اس نے اپنے پیشرو عیسائی مشنریوں پادری لی (REV. S. LEE) کی کتاب "عیسائیت اور اسلام کی مناظرانہ تحریریں" (CONTROVERTIAL TRACTS ON CHRISTIANITY AND MAHOMMEDANISM) مطبوعہ کیمبرج ۱۸۲۴ء اور پادری چارلس فاسٹر (REV. CHARLES FOSTER) کی تصنیف "از اسلام طشت ازبام" (MAHOMMEDANISM UNVEILED) مطبوعہ لندن ۱۸۲۹ء سے کافی فائدہ اٹھایا تھا۔ فنڈر کی کتاب 'میزان الحق' سب سے پہلے شوشی سے ۱۸۳۵ء میں طبع ہوئی اور اس کے بعد اس کا اردو ترجمہ مرزاپور سے ۱۸۴۳ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں اس نے اوّلاً یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ قرآن کی رو سے بائبل بھی الہامی کتاب ہے اور یہ کہنا کہ متاخر الہام کے ذریعہ قدیم الہام منسوخ ہوجاتا ہے اللہ تعالیٰ کی شانِ الوہیت سے بعید ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ زمانہ کے تغیرات کے ساتھ اپنے احکامات میں کوئی ترمیم کرے۔ کتاب کا دوسرا باب جو اس کے نصف سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس میں پادری فنڈر نے عیسائیت کے عقائد اور اس کی تعلیمات کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ عیسائیت کے پاس ایک مکمل ضابطۂ اخلاق موجود ہے جو ہر زمانہ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کافی ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں اسلام پر اعتراضات کیے گئے ہیں جن کا بڑا حصہ مذکورہ بالا پادری لی اور چارلس فاسٹر کی کتابوں سے لیا گیا ہے۔ اس میں نبی آخر الزماں کے متعلق پیشین گوئیوں سے انکار، قرآن کا بائبل سے ماخوذ ہونا، تقدیر پر اعتقاد، گناہوں پر ندامت اور معافی طلب کرنا نجات کے لیے کافی نہ ہونا اور رسول اللہ صلی اللہ کے اخلاق و اعمال پر اعتراضات کیے گئے ہیں۔ اخیر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں چھ افراد کے قبول عیسائیت کی روداد بیان کی گئی ہے۔

پادری فنڈر کا دوسرا مختصر کتابچہ 'مفتاح الاسرار' ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کی الوہیت اور تثلیث کی حقانیت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا ہے کہ قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ ان کی الوہیت کی مظہر ہیں۔ تثلیث کے ثبوت میں فنڈر کہتا ہے کہ مابعد الطبیعاتی نقطۂ نظر سے وحدت کا وجود محال ہے کیوں کہ ایسی وحدت محض کسی شے کے وجود تک محدود ہوگی جو مجہول اور بے حرکت ہوگی۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ ایسے کسی وجود کے ساتھ عقل اور ارادہ کو بھی شامل کیا جائے۔ فنڈر اس دلیل کو پیش کرتے ہوئے یہ نظر انداز کر دیتا ہے کہ عیسائیت تثلیث کے ذریعہ جن دو اشخاص کو الوہیت میں شریک کرتی ہے وہ عقل اور ارادہ کی طرح صفات نہیں بلکہ وہ بذات خود ان صفات کے حامل وجود ہونے کے دعوی دار ہیں۔

فنڈر کی تیسری تصنیف "طریق الحیات" تھی، جس میں اس نے عیسائیت کے نقطۂ نظر سے گناہ کی اصل حقیقت یا ماہیت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت کے ذریعہ نجات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس طرح یہ کتاب میزان الحق کا تتمہ ہے جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ گناہ کے متعلق اسلام کا یہ نظریہ کہ وہ انسان کی ایک داخلی کمزوری ہے جس پر توبہ اور عبادات کے ذریعہ فتح حاصل کی جا سکتی ہے، انسان کے ضمیر کو مردہ کر دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ گناہ صرف عمل کے ذریعہ ہی سرزد نہیں ہوتا بلکہ گناہ کے لیے انسانی رجحان اور ارادہ بھی قابلِ سزا ہے جس سے صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان کے ذریعہ ہی نجات مل سکتی ہے۔

فنڈر نے ان کتابوں کے علاوہ اردو زبان میں ایک رسالہ جس کا نام "شجر زندگانی" تحریر کیا تھا جس میں انجیل سے عیسائی عقائد و اخلاق سے متعلق اقتباسات جمع کیے گئے تھے۔

فنڈر نے ان کتابوں اور ان کے اردو ترجموں کو وسیع پیمانے پر مسلمانوں خصوصاً طبقۂ علماء میں تقسیم کیا۔ سب سے پہلے شمال مغربی صوبہ جات کی محمڈن سوسائٹی (MAHOMMADEN SOCIETY OF THE NORTH WESTERN PROVINCES) نے ان کتابوں خصوصاً 'میزان الحق' کے جواب میں چند مختصر کتابچے شائع کیے لیکن ان میں فنڈر کے اعتراضات کا شافی اور مدلل جواب دینے کے بجائے اکثر اعتراضات کے بارے میں

صرف یہ کہا گیا تھا کہ اس نے جو دلائل دیے ہیں وہ ناقابل فہم ہیں۔ فنڈر نے اپنی تصنیفات کے نسخے دربار اودھ سے منسلک مجتہد سید علی کو بھی ۱۸۴۲ء میں ارسال کیے تھے۔ مجتہد سید علی نے فنڈر کی فارسی دانی کی تعریف کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ ان کتابوں کو تحریر کرنے میں کسی اہل زبان کی خدمت سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک شاگرد سید محمد ہادی (جو مذہباً سنی العقیدہ تھے) کو فنڈر کا جواب لکھنے پر مامور کیا۔ سید محمد ہادی نے "کشف الاستار و بکس مفتاح الاسرار ونقص بعض القسیسین والاحبار"* کے نام سے ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ایک کتاب تحریر کی جو لکھنؤ سے ۱۸۴۵ء میں شائع ہوئی۔ کتاب اگرچہ فارسی زبان میں تھی لیکن اس میں طویل عربی عبارتیں اور اقتباسات نقل کیے گئے تھے۔ اگرچہ اس میں مفتاح الاسرار کا مدلل جواب دیا گیا تھا اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال سے عیسائیت کے عقائد کی تکذیب کی گئی تھی، لیکن میزان الحق میں اسلام پر کیے گئے اعتراضات سے بحث نہیں کی گئی تھی، بلکہ اسے "میزان اباطل" کہہ کر اس سے اعراض برتا گیا تھا۔

اسی زمانہ میں سید رحمت علی اور محمد کاظم علی سے فنڈر کی خط و کتابت ہوتی رہی جو ۱۸۴۲ء سے شروع ہو کر ۱۸۴۴ء یا ۱۸۴۵ء تک چلتی رہی۔ یہ سلسلہ اس وقت ختم ہو گیا جب فنڈر نے جواب دینے سے انکار کر دیا۔ ان خطوط میں محمد کاظم علی نے فنڈر سے یہ سوال کیا تھا کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود ہی یہ کہا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی ہدایت کے لیے آئے ہیں تو پھر ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ساری دنیا کے لیے مبعوث ہوئے تھے، کیا ان کی تکذیب نہیں ہے؟ فنڈر کو بالآخر یہ اقرار کرنا پڑا کہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت اصلاً یہودیوں کے لیے تھی اور ان کی تعلیمات ان کی دنیاوی زندگی میں (یعنی مصلوب ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے سے پہلے) تکمیل کو نہیں پہنچی تھیں۔ سید رحمت علی اور محمد کاظم نے اپنے خطوط میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت اور ان کے حواریوں کے الہام اور نبی آخر الزماں کے بارے میں پیشین گوئیاں

---

* کلکتہ ریویو جلد ۴۔ جولائی، دسمبر ۱۸۴۵ء۔ ص ۴۶۶ جس پر اس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس میں کتاب کا نام ناقص معلوم ہوتا ہے۔

کے متعلق مسائل بھی اٹھائے تھے جن کا کوئی شافی جواب فنڈر نہیں دے سکا تھا۔

فنڈر اور آگرہ کے مولوی سید علی حسین کے درمیان بھی اسلام اور عیسائیت کی حقانیت کے بارے میں خط و کتابت ہوتی رہی تھی جسے مرزا پور کے ایک مشنری ماہنامہ "خیر خواہ ہند" نے شائع کیا تھا۔ مولوی سید علی حسین نے بعد میں ردعیسائیت پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جو غالباً لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی لیکن اس کے بارے میں کوئی تفصیل دستیاب نہیں ہے۔ اسی زمانہ میں لکھنؤ سے کسی نامعلوم شخص نے فنڈر کی تصنیفات کے جواب میں "خلاصہ صولت الاضیغم" کے نام سے ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں ایک کتابچہ شائع کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتابچہ کا مصنف کمپنی کا کوئی ملازم تھا جس نے اپنا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

فنڈر کے جواب میں جتنی بھی کتابیں اس وقت تک لکھی گئی تھیں ان میں سے کسی میں بھی اس کے اعتراضات خصوصاً میزان الحق کا مدلل اور شافی جواب موجود نہیں تھا۔ بالآخر ۱۸۵۴ء میں فنڈر اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے درمیان آگرہ میں مناظرہ ہوا جس میں فنڈر لاجواب ہو کر مناظرہ کے آخری دن گھر بیٹھ رہا۔ اس مناظرہ کا تفصیلی حال "اظہار الحق" کے مقدمہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے بیان کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز جانا پڑا، اور فنڈر بھی یورپ واپس چلا گیا۔ اسے لندن کے چرچ مشن نے قسطنطنیہ میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے مقرر کیا اور اس سے مناظرہ کے لیے سلطان عبدالعزیز خان نے مولانا رحمت علی کیرانوی کو ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں مکہ مکرمہ سے قسطنطنیہ طلب کیا۔ فنڈر ایک بار پھر مولانا سے مقابلہ کرنے کے بجائے قسطنطنیہ سے واپس چلا گیا اور آخر کار سلطان عبدالعزیز خان اور صدر اعظم منیرالدین پاشا کی خواہش پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے 'اظہار الحق' تصنیف کی جس کے بعد عیسائی دنیا میں بھی 'میزان الحق' کا اعتبار ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا زمانہ اور اس دور میں

عیسائیت کی تبلیغ میں انگریزوں کی سرگرمیاں

جس زمانہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے پادری فنڈر سے مسیحیت کے عقائد کی تردید اور عیسائی مشنریوں کے اسلام پر اعتراضات کے جواب میں زبردست علمی مناظرے کیے۔ وہ صرف عیسائی مشنریوں کی اپنی مہم میں کامیابی یا ناکامی کا زمانہ نہ تھا، بلکہ سیاسی بالادستی کے ساتھ ساتھ اپنے فکری و تہذیبی اثر و رسوخ پیدا کرنے کے لیے انگریز بہت سے حربے استعمال کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی اور دینی زبانوں کو ختم کر دیا جائے اور انگریزی زبان کو ان کی جگہ رواج دیا جائے، اسی مقصد کے پیش نظر انگریزوں نے ملک میں بہت سے اسکول اور کالج قائم کیے، کیونکہ سیاسی دباؤ کو مستحکم کرنے کے ساتھ مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت میں اس سے بڑے فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔

مولانا کیرانویؒ واقف تھے کہ کسی بھی قوم کی زبان اس کے افکار، فلسفۂ حیات اور تاریخی و ثقافتی اقدار کا آئینہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ اس کی روایات، نفسیات اور اجتماعی خصوصیات کا عکس اور نقش دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی قوم کا تعلق اپنے ماضی اور علمی، فکری و دینی سرمایہ سے منقطع کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو سکتی ہے کہ زبان کو یا صرف اس کے رسم الخط کو بدل دیا جائے، دور کیوں جائیے خود ماضی قریب میں آپ کو ایشیا میں ایسی مثالیں مل جائیں گی جو اس دعویٰ کی صداقت کی شاہد عدل ہیں۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے دیکھا کہ انگریزوں نے اسی نقطہ نظر سے ہندوستان

میں کوشش کی کہ مشنری اور سامراجی لائحہ عمل کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کا رشتہ اپنے اسلامی تمدن اور تہذیبی اقدار سے کاٹ دیا جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ مغربی افکار و مسیحیت کے لیے لقمۂ تر بن جائیں۔ A. Le Chatelier نے اپنی کتاب La Conquete du Monde Musulman میں اس زمانہ کی مشنری سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوگا کہ کس حکمت عملی سے مشنریاں اس وقت عالم اسلام میں سرگرم عمل تھیں۔ یہ کتاب اصلاً فرانس سے شائع ہونے والے پرچہ La Revue du Monde Musulman کا ایک خاص نمبر ہے۔ اسلامی ممالک میں پروٹسٹنٹ مشنری کی سرگرمیوں کو منظر عام پر لانے اور کیتھولک مشنری کی غیرت کو بھڑکانے اور اس کے عزائم کو بیدار کرنے کے لیے پچاس سال قبل یہ پرچہ نکلتا تھا، شاتلیہ اس وقت اس کا مدیر تھا، اس شمارہ میں شامل طویل مقدمہ اسی کے قلم سے ہے۔ مصر کے ساعد الیافی اور محب الدین الخطیب نے اس کا عربی ترجمہ کر کے اپنے پرچہ "المؤید" میں شائع کیا تھا جو بعد میں ۱۳۰۵ھ میں 'الغارۃ علی العالم الاسلامی' کے نام سے کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔

مشنری سرگرمیوں کے جائزہ کے ساتھ اس کتاب میں ان اہم مشنری کانفرنسوں کی تجاویز اور قرار داد کی تفصیلات بھی درج ہیں جو ۱۹۰۶ء میں قاہرہ میں، ۱۹۱۰ء میں اڈنبرہ میں اور لکھنؤ میں ۱۹۱۱ء میں منعقد کی گئی تھیں۔

مقدمہ میں شاتلیہ ایک جگہ لکھتا ہے:

> "اس میں شک نہیں کہ صرف پروٹسٹنٹ اور کیتھولک مشنری کی سرگرمیوں سے اگر ہم چاہیں کہ مسلمانوں کے دل اسلامی عقائد سے خالی ہو جائیں، تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اس کی صرف ایک صورت یہ ہے کہ یوروپی افکار پھیلائے جائیں، انگریزی، جرمن، ہالینڈی اور فرانسیسی زبانوں کے پھیلانے سے اسلام یوروپ کے پرچوں میں کسی طرح جگہ پا سکتا ہے۔ اور ایک مادی اسلام کے لیے راہ ہموار ہوگی، اسی طرح مشنریاں اسلامی دینی افکار کو ناپید کرنے میں مصروف عمل رہیں گی جن کے وجود و نمود کا بقا اسی صورت میں ممکن ہے جب

وہ دنیا سے کٹ کر ہی رہیں۔"

ایک جگہ مصنف لکھتا ہے:

"عیسائی مشنریوں کی جد و جہد کا پہلا ثمرہ یہ ہے کہ نوجوان مردوں اور عورتوں کی اگرچہ ایک تھوڑی سی تعداد عیسائی بن سکی ہے، لیکن دوسرا اہم ثمرہ یہ ہے کہ ہر طبقہ کے مسلمان بتدریج مسیحی افکار اخذ کرنے کے عادی بنتے جا رہے ہیں۔"

اسی صفحہ پر وہ مزید لکھتا ہے:

"عیسائی مشنریاں اگر یہ دیکھیں کہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی جد و جہد کے نتائج سست ہیں تو اس سے ان کو مایوس نہ ہونا چاہیے، کیوں کہ یہ اب ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں یورپ کے علوم و فنون اور آزادیٔ نسواں کی طرف شدید میلان بڑھتا جا رہا ہے۔"[۱]

سنہ ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ میں مشنریوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، شاتلیہ نے اس کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ اسلامی حکومتوں کے زیرِ اقتدار رہنے والے مسلمانوں کی تعداد اب ۳۷۱۲۸۸۰۰ سے زیادہ نہیں ہے۔ خود مسلمانوں کی اکثریت کے ذریعہ ہی سیاسی اقتدار اسلامی خلافت سے منتقل ہو کر انگلینڈ، فرانس، روس اور ہالینڈ کے ہاتھوں چلا گیا ہے۔ مسلمانوں کی جو تعداد ان ممالک کے زیرِ اقتدار زندگی بسر کر رہی ہے وہ خلافتِ عثمانیہ کے تحت رہنے والے مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ پھر مسلمانوں کی جو تعداد دیسی ممالک کے زیرِ اقتدار بسر کر رہی ہے اس میں مستقبل قریب میں آنے والے انقلابات سے ضرور اضافہ ہوگا، اس طرح اسلامی ممالک میں مشنری مہم کو سرگرم باقی رکھنے کے سلسلہ میں عیسائی حکمرانوں کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔[۲]

قاہرہ اور لکھنؤ میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں جو قرار داد اور تجاویز منظور کی گئی تھیں اس سلسلہ میں شاتلیہ کی یہ تحریر ملتی ہے:

"ان تمام واقعات سے (یعنی عالمِ اسلام میں نشأۃ ثانیہ کے آثار سے) کلیسا کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ عزمِ مصمم اور ثابت قدمی کے ساتھ سرگرمِ عمل رہے، اور مشنری معاملہ کا زیادہ اہتمام کرے، اسی کی روشنی میں لکھنؤ کانفرنس

کے پروگرام میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:

۱۔ حالات حاضرہ کا مطالعہ۔

۲۔ مشنری تعلیم اور تعلیم نسواں کے دائرہ کی توسیع۔

۳۔ ضروری حد تک طاقت کے استعمال کی تیاریاں اور اس کے معیار کو بلند کرنے کی تدابیر" [۲]

یہ اقتباسات اس بات کے اندازہ کے لیے کافی ہیں کہ انگریزوں کی لسانی و تعلیمی پالیسی کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما تھے اور وہ اصلاً کس چیز کے حصول کی کوشش کر رہے تھے اس سیاق وسباق میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی کامیاب کوششوں کا تاریخ میں صحیح مقام متعین کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں اس وقت اردو اور فارسی اسلامی زبانیں تھیں جو علماء اور مفکرین کا ذریعہ اظہار تھیں، علوم وفنون کی تدوین ان ہی دو زبانوں میں ہوئی، فارسی کو تو ملک کی سرکاری زبان ہونے کا شرف حاصل تھا، اس عہد کے علماء اور مفکرین نے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے اور بغاوتوں کا سلسلہ جاری کرنے کے لیے ان ہی دو زبانوں کو تقریر وتحریر کا ذریعہ بنایا تھا۔

جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے تو یہ قرآن وحدیث کی زبان ہے، غیر مسلم ہندوستانیوں کے درمیان اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں اس کا کردار معاون رہا ہے، عیسائیت کی تبلیغ میں اس سے رکاوٹیں پیدا ہوئیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کو قرآن وحدیث سے الگ کر کے تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان میں ایک تعداد ایسے مسلمانوں کی بھی ہے جن کی تقریر وتحریر کا ذریعہ عربی زبان ہے [۳]۔ خود مولانا کیرانویؒ کی رد عیسائیت پر کتابیں عربی اور اردو زبانوں میں ہیں۔

جن ماہرین تعلیم کو اندازہ تھا کہ مشرقی اقوام میں یوروپی افکار اور تمدن کی اشاعت میں خود یوروپی زبان بڑا اہم کردار ادا کرسکتی ہے انھوں نے انگریزوں کو مشورہ دیا کہ ان اسلامی زبانوں کو ختم کرنے کی مہم چلائی جائے اور انگریزی کو ان کا قائم مقام بنادیا جائے۔

انگریزوں نے عملاً کالج، یونی ورسٹیوں اور سرکاری اداروں میں انگریزی کو لازمی زبان بنا دیا۔ توریت وانجیل کے نصوص اور منتخب حصّوں کے پڑھنے کے لیے انگریزی کا ناجائز استعمال کیا گیا، اور اسلامی زبانوں کی تعلیم وتدریس کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کی گئیں، ان کے سیکھنے اور سکھانے والوں کو ملازمت کے بہت سے مواقع سے محروم رکھا گیا کیونکہ وہ مشنری اسکولوں میں اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے قائل نہ تھے، گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنگ نے انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اپنے مشیر خاص مورخ ماکولی کے مشورہ پر یہ قانون بنایا کہ انگریزی زبان کی تعلیم وتدریس کا اعلیٰ انتظام کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، چنانچہ انگریزوں نے ملک کے مختلف حصوں میں اس نہج پر چلنے والے اسکول اور کالج قائم کیے تھے

انگریزوں کی اسلامی زبان دشمنی کا دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ ہندوستان کی قدیم زبانوں کے احیاء کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ ہندوؤں کی تاریخ اور تمدن سامنے آسکے اور ان کے اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ واریت کو ہوا دی جائے۔ ولیم ہوارڈ سل کے ان الفاظ سے انگریزوں کی اسلام دشمنی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

"ہماری مخالفت اور عناد پیروانِ محمد سے کہیں زیادہ شدید ہے، بمقابلہ اس اختلاف کے جو ہمارے اور شیوا اور وشنو کے پجاریوں کے درمیان ہے۔ یہ لوگ (مسلمان)، ہماری حکومت کے لیے زیادہ خطرناک ہیں۔ اگر ہم ان روایات کو اکھاڑ پھینکتے اور اپنی طاقت ور کوشش سے محمد کی مسجد کو مسمار کر دیتے تو یہ سچی عقیدہ اور ہماری برطانوی حکومت کے حق میں یقیناً بڑا اچھا ہوتا۔"

(منقول از 'ذکر وفکر' مولانا حسن مثنیٰ ندوی، جون ۱۹۸۸ء ص ۱۶)

انگریزوں نے کلکتہ میں ۱۸۰۰ء میں دان جیکرسٹ نامی ایک مستشرق کے زیر اہتمام فورٹ ولیم کالج قائم کیا، انگریزی، لاطینی اور سنسکرت کی تعلیم دینے کے لیے بہت سے کالج کھولے گئے، اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ زبان، ثقافت اور تہذیبی روایات کے تضاد کی بنا پر مسلمان اور ہندو طلباء کے مسائل بہت بڑھ جاتے، سنسکرت کو سبھوں کے لیے لازم کر دیا گیا تھا۔ گاندھی نے ایک بار اعلان کیا تھا کہ ہندوؤں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اردو

زبان کا مطلق سہارا نہ لیں، کیوں کہ یہ صرف مسلمانوں کی کتابوں کی زبان ہے، لیکن جہاں تک سنسکرت کا معاملہ ہے تو یہ ہندوستان کی مذہبی امہات کتب کی زبان ہے۔[۵ الف]

انگریزوں کی تعلیمی پالیسی سے کیا نتائج برآمد ہو سکتے تھے؟ مونیہ ولیس کی زبانی سنیے:

"وہ اپنی زبان کو خیرباد کہتے ہوئے اپنی ادبیات، فلسفہ اور دین کو حقیر سمجھتے ہیں، اور ہماری تربیت سے جو انحطاط ہوتا ہے اس کا آخر ہم سے بدلہ لیتے ہیں۔"[۵ ب]

گستاف لیبان نے مونیہ کے کلام پر یہ حاشیہ چڑھایا ہے:

"اس پر مستزاد وہ زبردست فکری شکوک و شبہات تھے جو خالص مغربی تربیت کی بنا پر ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو گئے تھے، کیوں کہ وہ تربیت اخلاق سے عاری ہوتی تھی، چنانچہ ان کے عادات و اطوار میں ان پختہ دینی بنیادوں کا فقدان ہوتا جو ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو گئی تھیں۔"[۵ ج]

مسلم اوقاف کا خاتمہ:

انگریزوں نے مساجد کے اوقاف پر قبضہ کر لیا اور ان ذرائع آمدنی پر بھی قبضہ کر لیا جن سے مساجد اور مسلمان بچوں کی تعلیم کے اخراجات پورے ہوتے تھے، بعض مسجدوں کو گرجوں میں تبدیل کر دیا گیا، ان میں دہلی کی ایک مسجد بھی شامل ہے جس پر انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ناکام ہونے کے بعد قبضہ کر لیا تھا۔ وائسرائے جنرل نے بعد میں دہلی کے لیے جب ایک خاص پادری کا تقرر کیا تو اس مسجد کو گرجے میں تبدیل کر دیا گیا۔[۶]

لارڈ ہسٹنگز نے ۱۱۸۵ھ مطابق ۱۷۷۲ء میں مساجد کے اوقاف پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا جو ناکام رہا، اس کے بعد لارڈ کارنواس نے ۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۳ء میں اس طرف توجہ دی، لیکن اس کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۵ء میں انگریزی عدالت نے اپنے انگریز جسٹس کو حکم دیا کہ ان اوقاف کو چھین لیا جائے، اس سے ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ٹیکس میں تین لاکھ پاؤنڈ کا اضافہ ہوا، بنگال سے صوبہ کے ٹیکس کی

آمدنی کی ایک چوتھائی انگریزوں تک نہیں پہنچ پاتی تھی، کیونکہ مدارس اور مساجد کے اوقاف میں شامل اراضی ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔

ہندوستان میں انگریز حکام کو اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ اسلامی اوقاف پر قبضہ کرنے سے مسلمان اپنے بہت سے اداروں سے محروم ہو گئے ہیں۔ اوقاف کے چھین لینے کے بعد مساجد، بڑے بڑے حوض، پارک اور دوسری چیزیں بالکل ویران ہو گئیں۔ مساجد یا تو گرجوں میں تبدیل کر دیے گئے یا پھر انگریز فوج کی چھاؤنیوں میں۔ ان کو خود اعتراف ہے کہ انھوں نے مسلمانوں پر عیدین کی نماز ادا کرنے اور دیگر دینی مراسم پر پابندی عائد کر دی تھی۔ عیسائی مشنریوں نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ جمعہ کو سرکاری چھٹی کا دن منسوخ کر کے اتوار کو سرکاری چھٹی کا دن قرار دیا جائے، تاکہ کسی حال میں بھی سرکاری اداروں میں ملازمین کو اسلامی آداب و روایات کے سامنے جھکنا نہ پڑے۔

ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں لکھا ہے:

"وہ (مسلمان) ہم پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو دینی امور کے انجام دینے سے روکا۔ ان کے نزدیک ہمارا یہ سب سے بڑا جرم تھا کہ ہم نے ان اوقاف کو چھین لیا جو مسلم سربراہوں نے مساجد اور تعلیم کے لیے مقرر کیے تھے، اور ہم نے ان کا دوسرا مصرف نکالا۔ عیدین اور نکاح و رواج کے ضوابط بدل ڈالے۔"

وہ مزید لکھتا ہے:

"ہم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ذلیل کیا، ان کے قانون وراثت کو مسخ کر دیا۔ ان کے دینی شعائر کو مضحکہ بناتے تھے، ان کے مساجد کے اوقاف اور سارے صوبے ہمارے قبضہ میں آ گئے۔"

انگریزوں نے صرف مسلم اوقاف ہی پر قبضہ نہیں کیا، بلکہ ان علماء کی ذاتی جائدادوں کو بھی غصب کر لیا جنھوں نے انگریزوں کے خلاف مہم میں حصہ لیا تھا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے جب زبان و قلم کے ساتھ ساتھ انگریزوں سے اپنی فوج لے کر عملاً جہاد کیا، تو بعض لڑائیوں میں انگریزوں کو سخت شکست ہوئی، لیکن آخری جنگ میں مولانا کی فوج انگریزوں

کی فوجوں کے مقابلہ میں پسپا ہو گئی۔ مولانا نے اس دور کے دیگر مشائخ اور علماء کی طرح مکہ کی طرف ہجرت کی، جس کی پریشانیوں کی ایک مستقل داستان ہے، مولانا کی ہجرت کے بعد انگریزوں نے ان کی تمام جائداد پر قبضہ کر لیا اور اپنے چند حاشیہ برداروں کے ہاتھ حقیر رقم میں فروخت کر دی۔

علماء کی آزمائش:

ہندوستان میں مشنریوں کی یلغار اور انگریزی سامراجیت سے ان کی ملی بھگت سے خطرات علماء کی نظروں سے مستور نہیں رہ سکتے تھے، انھوں نے فوراً اس فتنہ کو بھانپ لیا اور زبان و قلم کے ساتھ ساتھ عملاً ان کے خلاف جہاد کرنے پر کمربستہ ہو گئے۔ علماء نے فتویٰ دیا کہ انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کے دوستانہ مراسم، تعاون اور مشنری اسکولوں میں مسلمان بچوں کو بھیجنا ناجائز اور حرام ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے شدت اہتمام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ مولانا کو معلوم ہوا کہ ان کے ایک قریبی رشتہ دار کے بچہ کو مشن اسکول میں داخل کر دیا گیا ہے۔ مولانا اس پر بہت زیادہ پریشان ہوئے اور جب تک اس کو مشن اسکول سے دور نہ کیا، چین سے نہ بیٹھے۔ بعد میں یہی بچہ مولانا کی دعوتی اور علمی سرگرمیوں میں مولانا کے دست راست ثابت ہوا، تاریخ اب اس کو شیخ محمد سعید کے نام سے یاد کرتی ہے۔ مساجد کے منبر اور مدارس کے پلیٹ فارم سے علماء مسلمانوں کو خطاب کرتے تھے، مسلمانوں کو اس مسئلہ کی سنگینی سے آگاہ کیا جاتا تھا اور سامراجیت کے ساتھ ساتھ عیسائیت کے سخت مقابلہ کی دعوت دی جاتی تھی، انگریزوں سے ٹکر لینے میں پیش پیش وہی علاقے رہے، جن میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہوتی تھی، عقیدۂ جہاد کے سرچشمہ سے پھوٹنے والی قوت کا مقابلہ کرنے میں انگریزوں کو سخت مشقت کا سامنا کرنا پڑا۔

ہنٹر نے اعتراف کیا ہے کہ انگریزوں کا اولین اور سخت مقابلہ کرنے والے علاقوں میں سرفہرست ہندوستان کے شمالی اور مغربی حصے آتے ہیں، کیوں کہ ان ہی علاقوں میں علماء نے سب سے پہلے جہاد کے واجب ہونے کا فتویٰ دیا، بنگال کے مسلمانوں کا اس کے بعد

نمبر آتا ہے۔[۱۱]

انگریزوں نے جب دیکھا کہ مساجد کے اوقاف چھین لینے اور ان کو برباد کر دینے کے بعد بھی علماء کی دعوتی جدوجہد، اسلامی تعلیمات کی اشاعت، انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کو صف آرا کرنے کی دعوت اور نورِ قرآن سے مستنیر ہونے میں کچھ بھی فرق نہ آیا تو انھوں نے علماء پر عرصۂ حیات تنگ کر دینے کی سیاست پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ ان کو بدنام کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کیے گئے، دردناک قسم کی سزائیں دی گئیں جن میں کسی قسم کی سماعت کے بغیر قید، دائمی جلاوطنی اور پھانسی بھی شامل تھی، جب کسی عالم سے جواب طلب کرنا ہوتا تو عدالت میں اس کو حاضر کیا جاتا، کوئی افسر قرآن شریف اور حدیث کی کوئی کتاب لاتا، جہاد سے متعلق آیات اور احادیث نکالی جاتیں، پھر اس سے وہ افسر پوچھتا کہ ان آیات اور احادیث کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ اگر جواب یہ دیتا کہ یہ سب صحیح ہیں تو افسر کہتا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے خلاف جہاد کرنے کو واجب سمجھتے ہو۔ اس پر اس عالم کا موقف اگر یہ ہوتا کہ میں ایک گوشہ نشیں انسان ہوں، ان آیات اور احادیث کی صحت کا عقیدہ صرف اس لیے ہے کہ یہ قرآن اور حدیث میں وارد ہوئی ہیں۔ تو اس کو چار روز کی مہلت دی جاتی، اس دوران اگر وہ اپنا موقف بدل دیتا اور کسی اخبار میں اس کا اعلان کر دیتا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا۔ اس کے برعکس صورت میں پھانسی دے دی جاتی، یا پھر دائمی جلاوطنی۔[۱۲ الف]

لنکا اور انڈمان کے جزائر ایسے ہی بے گناہ "مجرم" علماء سے بھر گئے تھے۔ مسی بوزانے اپنی کتاب Muhammedanism in India میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ ایک انگریز مصنف بلنٹ کے الفاظ میں:

> "شہرت پانے والے ہر مولوی پر حکومت کی سخت نگاہ ہوتی تھی، ہر طرح سے اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا۔ اس پر بھی اگر وہ اپنے موقف پر قائم رہتا تو اس کو جزائر انڈمان جلاوطن کر دیا جاتا۔"[۱۲ ب]

علماء کے شوقِ شہادت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ایک بار ایک انگریز قاضی نے علماء کی ایک جماعت کو پھانسی دیے جانے کا فیصلہ صادر کیا تو وہ شہادت

کے تصور سے بے انتہا خوش ہوئے۔ قاضی کو یہ بات پسند نہ تھی کہ اس کا کوئی فیصلہ ان کے لیے مسرور کن ہو، چنانچہ اس نے فیصلہ بدل دیا اور کہا:

"اے باغیو! پھانسی تم کو عزیز ہے، راہِ خدا میں تم اس کو شہادت تصور کرتے ہو، ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے ذریعہ تمہاری کوئی امید بر آئے، یا ہم کسی مسرت کا باعث بنیں، اس لیے ہم پھانسی کے حکم کو منسوخ کرتے ہیں اور جزائر لنکا میں دائمی جلاوطنی کا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔"[۱۳]

انگریزوں کی معاون بعض تحریکیں:

عیسائی مشنریاں سمجھتی تھیں کہ اپنی سرگرمیوں کے لیے خود مسلمانوں میں سے کسی کو اگر آلۂ کار بنایا جائے تو یہ طریقہ زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے۔ شاتلیہ نے اپنی کتاب La Conquete du Monde Musulman میں لکھا ہے:

"مسلمانوں کے اندر مشنری سرگرمیوں کے بار آور ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ خود ان ہی میں سے کسی کو آلۂ کار بنایا جائے، اور اس کے ذریعے کام کیا جائے، کیونکہ کسی درخت کو کاٹنے کے لیے خود اسی کے کسی حصّہ کو استعمال کرنا چاہیے۔"[۱۴]

عیسائی مبلغین نے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے نتائج اگر کمزور نظر آئیں تو اس سے مایوس نہ ہونا چاہیے، کیوں کہ یورپ سے محبت اور عورتوں کی آزادی کا جذبہ بتدریج ان کے اندر بڑھ رہا ہے، ہندوستان میں انگریزوں کو دو ایسے افراد مل گئے، جن کی جدوجہد سے ان کے بہت سے مقاصد پورے ہوئے، یہ دو اشخاص تھے سر سید احمد خاں اور مرزا غلام احمد قادیانی۔

یہاں سر سید کی تحریک اور افکار کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، ۱۸۶۹ء میں برطانیہ کا سفر کیا، اور وہاں سے "عقیدہ حجاز سے لو، اور تہذیب و تمدن مغرب سے" کا پیام لے کر لوٹے، جنت، دوزخ، فرشتے،

حجت قیاس واجماع، ان سب کا انکار کرتے، تفصیل کے لیے مولانا حالی کی حیاتِ جاوید“ کا مطالعہ فرمائیے، سرسید نے قرآن کریم کی ایسی تاویل کی جس سے صرف قرآن ہی کی تحریف نہیں بلکہ عربی زبان اور قواعد کی بھی تحریف ہوتی ہے۔ سید جمال الدین افغانی نے سرسید کو ہندوستان میں دہریوں کا سرخیل قرار دیا تھا اور ان کی تردید میں اپنی کتاب" الرد علی الدھریین“ اصلاً فارسی زبان میں لکھی تھی، ان کے شاگرد محمد عبدہٗ نے اس کو عربی میں منتقل کیا' العروۃ الوثقیٰ' میں بھی سید جمال الدین افغانی نے سرسید اور علی گڑھ تحریک پر اس انداز کے چند مضامین شائع کیے۔ سرسید کی رائے کے مطابق انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا صحیح نہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران سرسید نے انگریز سپاہیوں کی حمایت کی تھی۔

۱۸۶۲ء میں سرسید نے' تبیان الکلام' نامی ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے انجیل میں تحریف واقع ہونے کا انکار کیا، رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس کے"خاص مقاصد“ تھے۔ یہی کتب کا اردو میں ترجمہ کرنے اور مغربی افکار کی اشاعت کے لیے انگریزوں نے ایک علمی انجمن بنانے میں سرسید کا تعاون کیا۔ غازی پور میں وکٹوریہ کالج اور علی گڑھ میں ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم ہوئے۔ یہ اصلاً دینی مدارس پر حملہ تھا جو مغرب کی رَو میں نہیں بہنا چاہتے تھے۔ اسلام اور عیسائیت میں ہم آہنگی، انگریزوں کے خلاف جہاد نہ کرنے کی دعوت، مسلم خواتین کی آزادی اور مغربی عورتوں کی تقلید، اور مسلمانوں کو"جامد“ افکار سے آزاد کرنا اور مغربی تہذیب میں پوری طرح رنگ جانا علی گڑھ تحریک کے خاص خاص مقاصد تھے۔ سرسید نے جس انداز سے قرآن کی تفسیر لکھی تھی اور انجیل کی تفسیر لکھنا شروع کیا تھا وہ اسلام اور عیسائیت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ایک نمایاں کوشش تھی علی گڑھ تحریک کے جو نتائج سامنے آئے ان کو مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں ایک ایسی "اینگلو محمڈن" اور "اینگلو انڈین" نسل پیدا ہوئی جس کی نفسیات کی ترکیب میں "محمڈن" عناصر کم اور انگریزی عناصر زیادہ تھے[۲۵]

شاتلیہ نے مشورہ دیا تھا کہ ملک کے باشندے اگر عیسائی اداروں سے گریز کریں، تو حکومت کو ایسے سیکولر ادارے قائم کرنا چاہئیں جن کو چلانے والے ملک کے ایسے باشندے

ہوں جن کی تربیت مغربی انداز سے ہوئی ہو۔ سرسید کی تحریک کو عیسائی مشنریاں کس نقطہ نظر سے دیکھتی تھیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۶ء میں قاہرہ میں منعقد ہونے والی مشنری کانفرنس میں اس تحریک پر بحث کی گئی۔ شاتلیہ کے الفاظ یہ ہیں:

"..... اس میں اس تحریک کو بھی موضوع بحث بنایا گیا جو ہندوستان میں داخل ہو چکی تھی اور سرسید احمد خان اس کے قائد تھے، علی گڑھ میں سرسید کے کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شکل میں جو کوششیں ہو رہی تھیں وہ بھی کانفرنس کے پیش نظر تھیں، پادری ویٹبرٹشٹ نے "جدید اسلام" کے عنوان پر تقریر کی اور اس میں بتایا کہ یورپ کی تعلیمات مسلمانوں کو عیسائیت سے قریب لا رہی ہیں۔"[۵۸]

اپنی تاریخ اور تہذیبی اقدار سے دوری، اسلامی عقائد کا استخفاف، ہر چیز میں مغرب کی تقلید اور آزادئ نسواں جیسے مشنری مقاصد اگر کسی کی نظر میں ہوں تو وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ علی گڑھ تحریک سے انگریزوں کے سامراجی اور مشنری مقاصد کو بروئے کار لانے میں اس سے کیا مدد مل سکتی تھی۔

انگریزوں کا دوسرا آلۂ کار مرزا غلام احمد قادیانی تھا جو ۱۸۳۹ء میں پنجاب کے قصبہ قادیان میں پیدا ہوا۔ اس کا گھرانہ انگریزی حکومت سے وفاداری اور مخلصانہ خدمات کے لیے مشہور تھا۔ بغاوت کو ختم کرنے میں اس گھرانہ نے انگریزوں کی ہر طرح مدد کی تھی، سکھوں کے انتہائی مخلصین میں شمار ہوتا تھا جن کے ہاتھوں مسلمانوں کو طرح طرح کی ایذارسانیوں کی ایک طویل داستان ہے۔[۵۹]

ایک برطانوی دستاویز میں آیا ہے کہ برطانیہ نے ۱۸۶۹ء میں انگریز مفکرین اور مسیحی سربراہوں کا ایک وفد ہندوستان بھیجا جس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کون سے ذرائع اور وسائل ہیں جن کو کام میں لا کر مسلمانوں کو قابو میں لانے اور برطانوی اقتدار کے سامنے جھکنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اس وفد نے سنہ ۱۸۷۰ء میں برطانیہ جا کر دو رپورٹیں پیش کیں، ان میں خاص بات یہ تھی کہ ہندوستان میں اکثر مسلمان اپنے دینی قائدین کی اندھی تقلید کرتے ہیں، لہٰذا ہم کو اگر کوئی ایسا شخص مل جائے جو نبی حواری ہونے کا دعویٰ کر سکے تو یقیناً اس کے

زیرِ علم بہت سے لوگ جمع ہو جائیں گے، لیکن اس پر کسی کو آمادہ کرنا نہایت مشکل کام ہے لیکن اگر یہ مسئلہ حل ہو جائے تو پھر حکومت اس شخص کی نبوت کا بہت خیال رکھ سکتی ہے، اور اپنی زیرِ سرپرستی بطریقِ احسن اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اب جب کہ ہم پورے ہندوستان پر مسلط ہیں، ہمیں اس کی ضرورت ہے تاکہ ہندوستانی عوام اور علماء کے درمیان فتنوں کا دروازہ کھول دیا جائے اور وہ اندرونی پریشانیوں کے شکار ہو جائیں۔[۱۸]

انگریزوں کا یہ خواب مرزا غلام احمد قادیانی کے ذریعہ شرمندۂ تعبیر ہوا، قادیانیت کے خط و خال اور اس کے ترکیبی عناصر کو یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ یہ اسلام اور نبوت محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے خلاف ایک بغاوت تھی جس کی سرپرستی انگریزی حکومت اپنے خاص مقاصد کے پیشِ نظر کر رہی تھی۔

انگریزوں نے مسلمانوں کے دلوں سے جذبۂ جہاد ختم کرنے کی بہت کوشش کی کیوں کہ سامراجی اور مشنری منصوبوں کے لیے یہ سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ لیکن انگریزوں کی کوشش بارآور نہیں ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس وقت صرف ہندوستان ہی نہیں، بلکہ پورا عالمِ اسلام سامراجیت کے خلاف میدانِ کارزار بنا ہوا تھا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی ؒ نے بھی عملاً جہاد میں حصہ لیا اور ان کی فوج نے اس سلسلہ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس وقت کیرانہ کی حیثیت ایک فوجی چھاؤنی کی سی ہو گئی تھی۔ مجاہدین کا نعرہ یہ تھا "ملک خدا کا اور حکومت مولانا کیرانوی کی" یہ اصلاً کمپنی کے نعرہ کا جواب تھا کہ "ملک بادشاہ کا اور حکومت کمپنی بہادر کی"۔ اسی لیے انگریزوں کو ایسے شخص کی ضرورت محسوس ہوئی جو عقیدہ جہاد ہی کو منسوخ کر دے اور مسلمانوں کو شرک و ثنیت سے قریب لا کر اسلام اور عیسائیت کے درمیان حائل خلیج کو پاٹ دے۔ مرزا غلام احمد قادیانی جس منصب پر فائز ہونا چاہتا تھا اس کے لیے حکمتِ عملی کے ساتھ تدریجی طور پر مراحل طے کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء میں اسلام کا دفاع کرنے والا، ۱۸۸۵ء میں مجدد زمانہ، ۱۸۹۱ء میں مسیح اور مہدی، ۱۹۰۰ء میں نبی ناقص، ۱۹۰۱ء میں نبی کامل و خاتم النبیین اور ۱۹۰۴ء میں کرشن یعنی معبود ہونے کا آخری مرحلہ طے ہوا۔[۱۹]

قادیانی افکار میں دو چیزیں بہت نمایاں ہیں: ایک دعویٰ نبوت، دوسری حرمتِ جہاد کا اعلان۔ ان ہی دو چیزوں کے ذریعہ یہ دعویٰ کرنا ممکن تھا کہ جہاد والی شریعت اب نازل ہونے والی وحی سے منسوخ ہو چکی ہے۔

ان دو تحریکات سے ہندوستان میں انگریزی سامراجیت اور مشنری کو جو تقویت ملی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ سامراجی اور مشنری جد و جہد سے ہندوستان میں بہت سی غیر مسلم تحریکوں نے بھی جنم لیا جن کی خطرناکی علی گڑھ تحریک اور قادیانیت سے کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ ۱۸۷۵ء میں بمبئی میں سوامی دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی، اس تحریک نے غیر ملکیوں کے خلاف علم عداوت و بغاوت بلند کیا۔ غیر ملکیوں سے ان کی مراد انگریز اور مسلمان تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں سے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ اپنے اصل دین کی طرف واپس آ جائیں۔ (جس طرح مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے پادریوں سے زبردست مناظرے کیے، اسی طرح مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے آریوں سے زبردست مناظرے کر کے دین و ملت کی بڑی خدمت انجام دی تھی)۔

سب سے زیادہ خطرناک مہاسبھا کی تحریک تھی جو ۱۹۲۳ء میں قائم ہوئی۔ اس کے لیڈر بابا ہردیال نے ایک بار کہا تھا، ہندو رگ و خون کا مستقبل چار چیزوں کا محور ہوگا: اسلام کا مقابلہ، ہندو ریاست کا قیام، مسلمانوں کو ہندو بنانے کی مہم، اور افغانستان پر قبضہ تاکہ وہاں کے باشندے بھی ہندو مت میں داخل کیے جا سکیں، ہندوستان میں مسلمانوں کے رہنے کی یہ شرط بتائی تھی کہ اپنے عربی اور اسلامی نام بدل دیں، ہندوؤں کا سا لباس پہنیں، ہندوؤں کی شخصیتوں کا احترام کریں، ان کے تہواروں میں شریک رہیں، ان کے رسم و رواج اور قومی روایات کو قبول کر لیں، اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے بجائے "ہندو مسلمان" یا "ہندو محمڈن" کہیں، بعض دینی شعائر کی ادائیگی کے لیے پہلے سے اجازت حاصل کر لیں۔ ان دو ہندو تحریکوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تعصب اور بغض و عداوت کی ایسی وسیع خلیج پیدا کر دی جس کو تاریخ کبھی بھی نہیں بھلا سکتی اور جس کے عفریت نے ہزاروں مسلمانوں کو نگل ڈالا ہے اور اب تک نگل رہا ہے۔ ماضی قریب اور حال میں جن خطرناک اسلام دشمن ہندو تحریکوں نے جنم لیا ہے وہ قارئین کی نظروں سے مخفی نہ ہوں گی، ان کی ہندو جارحانہ احیائیت اور

اور اسلام دشمنی کے واقعات آئے دن پیش آرہے ہیں جن کی تفصیلات ذکر کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے انگریزوں کی ستیزہ کاری پر کہا تھا:

بسکہ فعال مایرید ہے' آج
ہر سلحشور ہندوستان کا

لیکن اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب ہندوستان کا ہر سلحشور فعال مایرید تو نہیں بن سکا، یہ الگ بات ہے کہ فعال مایرید بننے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے، مگر یہ فیصلہ کرنا تاریخ کا کام ہے کہ آیا یہ خواب شرمندۂ تعبیر بھی ہو سکتا ہے۔

اس تاریخی پُر آشوب دور کے سیاق و سباق میں اگر مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے مجاہدانہ، مناظرانہ، دعوتی اور اصلاحی کارناموں کو رکھ کر دیکھا جائے تو ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مولانا خدا کی رحمت ہی کی ایک صورت تھے، مولانا کے تجدیدی اور مجاہدانہ کارناموں کا اعتراف صرف اس دور کے علماء اور معاصرین نے ہی نہیں، بلکہ خود خلافت عثمانیہ نے بھی کیا، چنانچہ خلیفۂ وقت نے مولانا کو ترکی آنے کی دعوت دی اور خلعت خاص سے سرفراز کیا، وہیں مولانا نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "اظہار الحق" تصنیف کی، جس کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے، اور جس کے بارے میں **London Times** نے تبصرہ کیا تھا: "اگر ہم اس کتاب کو پڑھتے رہیں تو مسیحیت پر ہمارا باقی رہنا دشوار ہے۔"[۱۳]

حواشی وحوالہ جات:

[۱] محمد قطب۔ هل نحن مسلمون ص ۵۴، مطبوعہ دار الشروق بیروت و قاہرہ ۱۹۷۳ء

[۲] الغارة على العالم الاسلامی از شاتلیہ، ترجمہ مساعد الیافی و محب الدین الخطیب ص ۴۰، المطبعة السلفیة، القاہرہ۔ منقول از هل نحن مسلمون، ص ۱۵۹۔

[۳] ایضاً ص ۹۴۔ [۴] ایضاً ص ۸۹-۸۸ [۵] انور الجندی، العالم الاسلامی والاستعمار ص ۵۹، ص ۳۶۳، ساداتی، تاریخ المسلمین فی شبہ القارة الہندیہ ۲۵/۱، ۲۲۴/۲، ۲۲۵، مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی "المسلمون فی الہند ص ۱۱۱"

[۶] اقوال ترجی، الہند الجدیدة ص ۱۳۵، البشیشی، الہند خلال العصور ص ۱۰۸، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نحن والحضارة

الغربیۃ ص ۲۹، شاکر۔ الغارۃ علی العالم الاسلامی ص ۸، خالدی و فروخ: التبشیر والاستعمار ص ۱۵، نور الدین داؤد: لحرب فی الفردوس ص ۱۰۰۔

[۵] ایضاً۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی: المسلمون فی الہند ص ۱۰۰، نور الہندی: العالم الاسلامی والاستعمار ص ۲۲۳-۲۲۵، سلوانی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیۃ ۱/۳۲۹، احسان حقی: مأساۃ کشمیر ص ۵۳-۶۵۔ [۶] ب۔ پیٹر ہارڈی: انگریز کی ۔۔۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ص ۵۰، مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی: الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ، دار الانصار القاہرہ ۱۳۹۷ھ ص ۱۹۷۔ [۷] ج۔ حضارات الہند ص ۲۹۳

[۸] مولانا ابوالحسن علی ندوی: المسلمون فی الہند ص ۹۱، شیخ محمد سلیم: اکبر مجاہد ص ۱۰۱، جمال الدین افغانی: العروۃ الوثقیٰ ص ۳۴۰، عبد المنعم النمر: تاریخ الاسلام فی الہند ص ۵۰۴، عبد العزیز فوار: الشعوب الاسلامیہ ص ۵۵۶۔

[۹] محمود شاکر: پاکستان ص ۲۶، شاکر: الغارۃ علی العالم الاسلامی ص ۶۰، احسان حقی: مأساۃ کشمیر ص ۵۳۔

[۱۰] ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر: انڈین مسلس ص ۲۰۰، عبد المنعم النمر: تاریخ الاسلام فی الہند، ص ۴۰۹۔

[۱۱] ایضاً، ص ۴۰۳، ماخوذ از انڈین پالیٹکس ص ۷۹۔ [۱۲] عبد العزیز فوار: الشعوب الاسلامیۃ ص ۵۵۵۔

عبد المنعم النمر: تاریخ الاسلام فی الہند ص ۴۲۲، ص ۴۴۳۔ [۱۳] مولانا مسعود عالم ندوی: تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۵۰۰۔ جمال الدین افغانی: العروۃ الوثقیٰ ص ۳۱۳، ۳۱۴، ابوالحسن ندوی: ربانیۃ لا رہبانیۃ مطبوعہ دار الفتح بیروت ۱۹۶۳ء۔ نور الدین داؤد: لحرب فی الفردوس ص ۱۰۱۔

[۱۴] کتاب المسلمین فی تحریر الہند از عبد المنعم النمر ص ۳۴۳، ۴۴۴۔ مصنف نے اس کتاب میں انگریزوں کی وحشت و بربریت کے سلسلہ میں خود انگریزوں کے متعدد اقوال نقل کیے ہیں، نیز دیکھئے: اذاعت ریاح الایمان از مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۱۰۰۔ [۱۵] الغارۃ علی العالم الاسلامی ص ۹۳، [۱۶] ابوالاعلیٰ مودودی: نحن والحضارۃ الغربیۃ ص ۱۰۹۔

[۱۷] الغارۃ علی العالم الاسلامی ص ۵۲، [۱۸] ابوالاعلیٰ مودودی: ما ہی القادیانیہ ص ۹، ۱۰، دار القلم کویت ۱۹۶۹ء۔ احسان الٰہی ظہیر: القادیانیہ، ادارہ ترجمان السنہ، ص ۲۳ (۱۹۶۹ء)، محمد یوسف بنوری: موقف الامۃ الاسلامیۃ من القادیانیہ ص ۱۱۳، ۱۹۶، الحرکات الفکریۃ الہدامۃ، از عبد الرحمن حبنکہ المیدانی، دار القلم دمشق و بیروت ۱۳۹۲ھ ص ۲۹۵، محمد اسماعیل ندوی: القادیانیۃ عرض و تحلیل، قاہرہ ۱۹۷۰ء ص ۱۲، ۹۳۔

[۱۹] بنوری: موقف الامۃ الاسلامیۃ من القادیانیہ ص ۱۴، احسان الٰہی ظہیر: القادیانیہ ص ۲۳،

[۲۰] المودودی: ما ہی القادیانیۃ ص ۲۱، ۲۲۔ اسماعیل ندوی: القادیانیۃ عرض و تحلیل ص ۲۱، ۵۱، بنوری ص ۱۳۔ محمد البہی: الفکر الاسلامی الحدیث ص ۲۶، ۴۷۔

[۲۱] احسان حقی: تاریخ شبہ الجزیرۃ الہندیۃ الباکستانیۃ ص ۴۰۳۔ ۴۰۶

[۲۲] اس مضمون میں ڈاکٹر محمد عبد القادر خلیل کی کتاب المناظرۃ الکبریٰ بین الشیخ رحمۃ اللہ والدکتور القسیس فنڈر سے خصوصی استفادہ کیا گیا ہے۔ مطبوعہ دار ابن تیمیہ للنشر والتوزیع والاعلام، الریاض ۱۴۰۵ھ۔

مولانا نذر الحفیظ ندوی
استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ کی وسیع اور دور رس سازش
اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا بروقت انتباہ

[اس مقالہ میں عیسائیت کے فروغ کے لیے برطانوی و پرتگالی سازشوں کا پس منظر بیان کرکے یہ دکھایا گیا ہے کہ اگر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان کے رفقائے کار نے بروقت اس سازش کو ختم کرنے کا تہیہ نہ کرلیا ہوتا تو ہندوستان کا حال بھی اندلس سے زیادہ مختلف نہ ہوتا۔] (ادارہ)

شام و فلسطین اور مصر میں جب صلیبی طاقتوں کو شکست فاش ہوئی تو انھوں نے مشرقی ممالک میں ایک ایسی عیسائی حکومت کے قیام کا خواب دیکھنا شروع کیا جو طاقت کے بل پر مسلمانوں سے مقامات مقدسہ چھین لے، دوسری طرف غیر مسلم ملکوں پر اسلامی فوجوں کی یورش پر پابندی لگادی جائے، جیساکہ پرتگالی حکمراں ہنری (م ۱۴۶۰ء) کے اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے جو اس نے عیسائی مبلغوں کو بھیجا تھا۔ یہ وہی حکمراں ہے جس کے باپ یوحنا نے مسلمانوں کو اسپین سے نکالنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا، اب اس کے عزائم یہ تھے کہ اسپین سے مسلمانوں کے اخراج کے بعد ہندوستان کا رُخ کیا جائے تاکہ اس ملک کو بھی مسیحی دائرے میں داخل کرلیا جائے۔ چنانچہ ۱۴۱۶ء میں ہنری نے یسوع مسیح کے مجاہدین کے نام سے ایک تبلیغی دستے کی تشکیل کی اور انھیں خطیر رقمیں دے کر افریقہ اور ایشیا روانہ کردیا گیا تاکہ تبلیغی جدوجہد کا میدان وسیع تر کیا جاسکے۔

اس سلسلہ میں ایک وفد ہندوستان بھی آیا، اس نے مختلف مقامات کا دورہ کرکے واپسی پر یہ رپورٹ پیش کی کہ فوجی، سیاسی، تجارتی اور دینی میدانوں میں وہاں کامیابی کے غیر معمولی امکانات ہیں، اس رپورٹ کے بعد ہی ہندوستان کے ساحلی علاقوں (گوا، دمن، دیو، کلکتہ اور

مالابار) میں پرتگالیوں نے سب سے پہلے تجارتی دفاتر قائم کیے، اس کے بعد تجارت کے پردے میں اپنے اصل مشن کا آغاز کر دیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان ساحلی علاقوں میں لبنان اور شام سے عیسائیوں کو لاکر آباد کیا گیا جو تجارت کے ساتھ عیسائی دعوت کے کاموں میں بڑی مہارت اور تجربہ رکھتے تھے، انھوں نے وہاں آباد ہوتے ہی غیر مسلم آبادی پر اپنا حربہ آزمایا جو غیر معمولی طور پر کامیاب رہا، دوسری طرف ان ساحلی علاقوں پر انھوں نے قبضہ کر کے پرتگال کے ساتھ تجارتی تعلقات کو مزید مستحکم کر لیا جو آگے چل کر عیسائیوں کے لیے فوجی اور اقتصادی اعتبار سے بڑا مفید ثابت ہوا۔

پرتگالیوں نے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے دربار میں مختلف اوقات میں تین وفد بھیجے، اکبر نے ان وفود کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور انھیں آگرہ میں ایک گرجا گھر کے قیام کی اجازت دے دی، اس کے ساتھ شہزادہ سلیم کو تربیت کے لیے ان کے حوالے کر دیا، تین سال تک یہ عیسائی وفد اکبر کے پاس اس امید میں مقیم رہا کہ شاید بادشاہ عیسائی مذہب اختیار کرلے، لیکن ۱۵۱۸ء میں یہ وفد ناکام و نامراد واپس گیا، دوسری طرف شہزادہ سلیم پر کسی طرح یہ عیسائی اثر انداز نہ ہو سکے، اسی طرح دوسرا وفد ۱۵۹۰ء میں دربار اکبری میں حاضر ہوا اور ۱۵۹۲ء میں ناکام واپس گیا۔ جب پرتگالیوں کو اپنی ناکامی کا احساس ہوا تو انھوں نے پھر تیسرا وفد روانہ کیا جس نے لاہور اور آگرہ میں گرجا گھروں کی تعمیر کی اجازت اور سہولت حاصل کر لی جس کی وجہ سے آگے چل کر مشکلات پیش آئیں اور تاریخ کا رُخ تبدیل ہو گیا، یہ سب اکبر کے عہد میں ہوا۔

شاہ جہاں نے ۱۶۳۲ء میں بنگال کے حاکم قاسم خان کو حکم دیا کہ عیسائیوں کے مراکز پر قبضہ کر کے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے تاکہ لوگوں کو عیسائیوں کے شرور و فتن سے نجات مل سکے، چنانچہ ہوگلی میں عیسائیوں کے مستحکم اور مضبوط قلعوں کو شاہ جہانی فوجوں نے مسمار کر دیا، اس خوں ریز معرکہ میں دس ہزار عیسائی مقتول اور چار ہزار اسیر ہوئے، نیز ان دس ہزار ہندوستانیوں کو بھی پرتگالیوں کے قبضہ سے نجات دلائی گئی جنھیں جہاز پر قید رکھا گیا تھا تاکہ یورپ کی منڈیوں میں ان کو غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا جائے۔

اورنگ زیب عالم گیر نے اپنے عہد حکمرانی میں بنگال کے حاکم شائستہ خاں کو پرتگالیوں کے رہے سہے مراکز کے خاتمے کا فرمان جاری کیا، اس مقصد کی تکمیل میں ڈچ اور فرنچ کمپنیوں

نے بھی مدد کی تھی اس لیے کہ پرتگالیوں نے تجارت پر اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔

۱۴۹۸ء میں پرتگالیوں نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر قدم رکھتے ہی کوچین اور گوا میں اپنی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ اس مقصد کے لیے مختلف یورپی ممالک سے تعلیم یافتہ اور تجربہ کار اور سرگرم مبلغین طلب کیے گئے، پاپائے روم کی طرف سے ۱۵۴۲ء میں ایک عیسائی کارکن فرانسز زیویر کو (جس نے پیرس میں تعلیم حاصل کی تھی اور متعصب کیتھولک تھا) عیسائی مبلغین کے وفد کا سربراہ بنا کر گوا بھیجا گیا، اس نے گوا کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی عیسائی مرکز جانے کے بجائے ننگے پاؤں جذاموں کے شفاخانے کا رخ کیا، وہاں اس نے مریضوں کے قدم چومے، ان کے زخم دھوئے اور انھیں مسیحیت کی بشارت دی۔

۱۵۴۲ء میں اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ عیسائی دعوت کا کام کرنے والوں کی ٹریننگ ضروری ہے، چنانچہ قدیس یونیورسٹی کے نام سے گوا میں ایک تربیتی مرکز قائم کیا گیا، اور ایشیا کے پورے خطے میں کام کرنے والے تمام عیسائی مبلغین کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہ پہلے یہاں ٹریننگ حاصل کریں، اس کے علاوہ جاپان اور چین سے لوگوں کو اغوا کر کے یہاں لایا جاتا، اور ان کو عیسائی مبلغوں اور مربیوں کی نگرانی میں زبردستی عیسائی بنایا جاتا۔ ان کوششوں سے فرانسز زیویر مطمئن نہیں تھا، اس نے اپنے منصوبے کے مطابق تمام عیسائی مبلغین کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ چین و جاپان کے ادیان و مذاہب، ان ملکوں کے باشندوں کی عقلی و فکری، سماجی و معاشی حالات کا گہرا مطالعہ کریں اور ان کی سطح پر اتر کر ان سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کریں، ان ملکوں کی زبان سیکھیں اور یہاں کے اطوار و عادات اور رسوم و رواج پر گہری نظر رکھی جائے، اس منصوبے نے آگے چل کر عیسائی مبلغین کو خاصا فائدہ پہنچایا۔

پرتگالیوں نے گوا پر (۱۵۱۰ء میں) قبضہ کرتے ہی اسپین کے طرز پر ایک ایسی عدالت قائم کر دی جو لوگوں کے عقائد و خیالات کی چھان بین کر کے زبردستی ان کو عیسائیت کے دائرے میں داخل کرتی، جو لوگ انکار کرتے ان کے ساتھ انتہائی وحشیانہ سلوک کیا جاتا، کسی غیر مسیحی کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ کوچین اور گوا کے علاقوں میں رہ سکے، کم سن بچوں، بچیوں اور یتیموں کو اغوا کر کے عیسائی مراکز میں رکھا جاتا، پھر پرتگال کی راجدھانی لشبونہ بھیج دیا جاتا، جہاں باقاعدہ انھیں

عیسائی بنانے کا کام شروع کر دیا جاتا۔ گوا کے صرف ایک علاقہ سے صرف تین سال کے عرصہ میں چودہ سال کی عمر کے بچوں کو اغوا کر کے لشبونہ بھیج دیا گیا، ممتاز محل کی دو خادماؤں کا بھی اغوا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ بعد لشبونہ سے مزید فوج گوا اور کوچین اس مقصد سے بھیجی گئی کہ دیہاتوں اور شہروں سے بچوں کو زبردستی اغوا کیا جائے، اگر اغوا نہ ہو سکے تو غریبوں اور فاقہ کش لوگوں سے ان کے بچے اونے پونے خرید لیے جائیں، صرف ایک سال (۱۵۶۰ء میں) دس ہزار اور ۱۵۶۱ء میں تیرہ ہزار بانوے ہندوؤں کو زبردستی عیسائی بنا لیا گیا، اس طرح ۱۵۷۰ء تک زبردستی عیسائی بنائے جانے والوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۱۵۸۰ء میں پرسورام جوشی عیسائیت کی تعلیم دینے کے بعد پادری کے منصب پر فائز کیا گیا، اس کے بعد مزید نو ہزار چار سو ہندو پنڈتوں کو عیسائی بنا کر تبلیغ کے لیے چین و جاپان بھیجا گیا، لیکن ان سب کے باوجود پرتگالیوں کا احساس تھا کہ انھیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو رہی ہے، خصوصاً برہمنوں نے ابھی تک معقول تعداد میں عیسائیت کو قبول نہیں کیا ہے، چنانچہ پرتگالیوں نے اس مقصد کے لیے فوج کا سہارا لیا جس نے مندروں پر دھاوا بول کر ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ہندوؤں کو مجبور کر دیا کہ وہ عیسائیت قبول کر لیں۔

پرتگالیوں نے مختلف احکامات اور قوانین کے ذریعہ اپنی مقبوضات کو غیر عیسائیوں کے وجود سے بے دخل کر دیا۔ مثلاً ۱۵۵۹ء میں یہ فرمان جاری ہوا کہ مقبوضہ علاقوں میں طبی خدمات صرف عیسائی ہی انجام دیں گے۔ ایک دوسرے فرمان کے ذریعہ صرف عیسائیوں ہی کو سرکاری عہدہ کا اہل قرار دیا گیا۔ ایک دوسرے حکم میں یہ کہا گیا کہ جو ہندو بچے یتیم ہو جائیں گے ان کی نگرانی اور تربیت عیسائیوں کے ذمے ہوگی اور وہی ان کے والی وارث ہوں گے، پادریوں کو یہ حق دے دیا گیا کہ گوا کے تمام علاقوں سے غیر عیسائیوں کو بے دخل کر سکتے ہیں، اگر وہ مسیحیت قبول کرے تو وہ اس قانون سے مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ان پادریوں کو اس کا پورا اختیار تھا کہ جو مسیحیت قبول نہ کرے اس کو زندہ جلا دیا جائے یا اس پر اتنا تشدد کیا جائے کہ وہ اس دنیا ہی سے کوچ کر جائے۔ اس حکم اور تفویض کے مطابق ڈی گاما نے ان سیکڑوں مسلمانوں کو سمندر میں غرق کرایا جو حج کے ارادہ سے جہازوں پر سوار ہو کر حجاز جانا چاہتے تھے۔ ایک

دوسرے پادری ایلڈا کے متعلق لکھا ہے کہ جو مسلمان خواتین مسیحیت قبول نہیں کرتی تھیں، وہ ان کی آنکھیں پھوڑ دیتا تھا، ایک تیسرے پادری بوکویرک کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ مسلمان خواتین کی ناک اور مردوں کے ہاتھ کاٹ کر انھیں زندہ جلا دینے میں لذت محسوس کرتا تھا، اس نے پرتگالی بادشاہ کو ایک خط میں بڑے فخر سے لکھا کہ میں نے شہر میں کسی مسلمان کی عمارت قائم رہنے نہیں دی، جو مسلمان بھی میرے ہاتھ لگ جاتے ہیں میں ان کو زندہ جلا دیے جانے کا حکم دیتا ہوں۔ بوکویرک ان علماء کو بھی زندہ جلا دیتا تھا جو مسلمانوں کو مسیحیت کے قبول نہ کرنے کی ترغیب دیتے تھے، اس طرح اس ظالم کے ہاتھوں سیکڑوں علماء زندہ جلائے اور آگ میں بھونے گئے، ہزاروں خواتین، بچوں اور بوڑھوں تک کو اس نے آگ میں جلوا دیا۔

ایک خاص عیسائی تقریب کے موقع پر جنوبی ہند کے ساحلی شہروں اور دیہاتوں پر بوکویرک کی فوجوں نے مسلمانوں پر اچانک حملہ کر کے ایک دن میں چھ ہزار مردوں کو اس طرح تہ تیغ کیا کہ گلیاں اور سڑکیں خون میں نہا گئیں، خود گوا جیسے شہر کی جامع مسجد میں خواتین اور بوڑھوں، بچوں کو جمع کر کے چاروں طرف سے آگ لگا دی گئی، ایسا بھی ہوا کہ مردوں کو زندہ جلا کر ان کی بیویوں اور لڑکیوں کو عیسائی حکام کے حوالے کر دیا جاتا تاکہ وہ ان کو لونڈیاں بنا کر رکھیں یا پھر ان کی شادی عیسائی مردوں سے کر دی جاتی تاکہ ان کا وجود ہی تحلیل ہو کر رہ جائے۔

پرتگالی استعمار کے تشدد سے انسان تو انسان جانور اور درخت تک محفوظ نہیں تھے، ۱۵۵۵ء میں کانانور شہر میں نو ہزار مسلمانوں کو قتل کر کے ان کے تمام پالتو جانوروں کو بھی ذبح کر دیا گیا اور ان کے ناریل کے چالیس ہزار درختوں کو کاٹ کر جلا دیا گیا۔

۱۵۴۰ء میں یوحنا سوم نے یہ فرمان جاری کیا کہ گوا اور کوچین کے علاقوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے جو اوقاف یا دینی مراکز ہیں ان کو منہدم کر کے ان کی جگہ گرجا گھر بنائے جائیں اور اوقاف کی آمدنی کو مسجد و مندر پر صرف کرنے کی بجائے گرجا گھروں پر وقف کر دیا جائے۔ چنانچہ ساڑھے تین سو مسجدوں، مندروں کو پرتگالی فوجوں نے زمین بوس کر دیا، جہاں بعد میں گرجا گھر تعمیر کیے گئے۔

انگریزی استعمار کے حربے:

پرتگالیوں نے یورپ میں ہندوستان کی زرخیزی، شادابی اور خوش حالی کا زبردست پروپیگنڈہ کیا تھا اور یہ خوش خبری بھی عیسائی دنیا کو دی تھی کہ وہاں عیسائیت کے پھلنے پھولنے کے سنہرے مواقع ہیں۔ چنانچہ یورپی قزاقوں نے بڑی تعداد میں ہندوستان کا رُخ کیا تاکہ اس سونے کی چڑیا پر جلد سے جلد قبضہ کرلیں، سترہویں صدی میں فرنچ اور ڈچ تاجروں نے سورت اور گجرات کے علاقوں میں اپنے تجارتی مراکز قائم کردیے۔ ان کی تجارتی سرگرمیاں اس حد تک بڑھ گئیں کہ انھوں نے پرتگالیوں کی اجارہ داری پر ہاتھ صاف کردیا۔ لیکن آخر میں انگریزوں نے ان تینوں کا پتہ ہندوستان سے کاٹ کر خود اس سونے کی چڑیا کے بلاشرکت غیرے مالک بن گئے۔

سب سے پہلا انگریز جس نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اس کا نام پادری تھامس سٹیفنز تھا جو سنہ ۱۵۷۹ء میں گوا آیا تھا۔ تین اور انگریز ہندوستان آئے اور انھوں نے سنہ ۱۵۹۹ء میں ہندوستان کے تعاون و اشتراک سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ سنہ ۱۶۰۰ء میں ملکہ ایلزبتھ نے فرمان جاری کیا کہ لندنی تاجروں کی کمپنی ایسٹ انڈیا کے ساتھ معاملہ کرے گی، اس کمپنی کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ جس غیرمسیحی کے ساتھ چاہے صلح یا جنگ کرے۔

سنہ ۱۶۰۸ء میں مسٹر ولیم ہاکنز برطانوی سفیر بن کر جہاں گیر کی خدمت میں جیمس اول کا خط پیش کیا۔ اس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ ہندوستان میں انگریزوں کو تجارتی سہولتیں مہیا کی جائیں، لیکن جہاں گیر نے یہ درخواست مسترد کردی۔ لیکن جب سنہ ۱۶۱۳ء میں انگلستان کے بادشاہ کا پیغام لے کر مسٹر تھامس آئے تو انگریزوں کو سورت میں کارخانوں کے قیام اور بعض ساحلی علاقوں میں تجارتی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دی گئی۔

انگریز جس علاقہ میں بھی رہے انھوں نے رہائش کے لیے مخصوص جگہ کا انتخاب کیا، اس طرح تجارتی قافلوں اور کاروبار کی حمایت و حفاظت کا بہانہ بنا کر اپنی مخصوص فوج بھی تیار کرلی۔ مغل فوجیوں اور حکام نے اس فوجی تیاری کو یہ کہہ کر نظرانداز کردیا کہ یہ لوگ صرف تجارت پیشہ ہیں، اور ایک طاقت ور اور مستحکم حکومت کے لیے کسی طرح خطرہ نہیں بن سکتے۔ اس کو اس بات سے

بھی تقویت ملی کہ ابتدائی مراحل میں انگریزوں اور مقامی فوجوں کے درمیان معرکہ ہوا تو انگریزوں کی فوجی ناکامی ثابت ہو گئی۔ دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں عیسائیوں کی تعداد بہت کم تھی اور عیسائی مبلغین نے بھی اپنا کام شروع نہیں کیا تھا، اس لیے انگریزوں کے ساتھ بدگمانی کے بجائے حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ اپنی کمپنیوں کو مدغم کر دیں۔ لیکن انگریزوں نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا، اس بنا پر عالم گیر نے ہوگلی میں انگریزوں کے مضبوط ٹھکانوں کو تباہ و برباد کر دیا، لیکن پھر بعد میں ان کو اپنے کارخانوں اور کمپنیوں کے قیام کی اجازت مل گئی جس کے بعد ہی کلکتہ شہر کی داغ بیل پڑی۔

* انگریزوں نے مسلمانوں کی قوت و شوکت کا اندازہ کر کے دو باتوں کو اپنی گرہ میں باندھ لیا تھا:

۱۔ کل ہند پیمانے پر تجارتی سرگرمیوں کی وسیع تنظیم و ترتیب ضروری ہے تاکہ برطانوی مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ لیکن اس کے ساتھ خود اس ملک کی تجارتی سرگرمیوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا ضروری ہے۔

۲۔ اس کا پورا اہتمام کیا جائے اور مظاہرہ بھی کہ انگریزوں کو ہندوستان کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی سے کوئی مطلب نہیں تاکہ اس بہانے پورے ملک میں قدم مضبوط کیے جائیں، اسی طرح ساحلی علاقوں کو اپنے تصرف میں کر کے باہر سے ایسے جدید ترین اسلحے درآمد کیے جائیں جو مغل فوجوں کے پاس نہیں ہیں۔

انگریزوں نے ان دو اصولوں پر عمل کر کے پورے ملک میں اپنے قدم جما لیے، انھوں نے نوابوں، صوبائی اور مرکزی حکام کے درمیان غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا کر کے اس ملک کے شیرازے کو پراگندہ کر کے رکھ دیا۔

انگریزوں نے پرتگالیوں کی دعوتی جدوجہد اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بات کا بڑا اہتمام کیا کہ اپنی تجارتی کمپنیوں کو صرف تجارتی مقاصد کے فروغ میں

معروف کر دیا اور عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کی سرگرمیوں سے ان کو دور رکھا لیکن خفیہ طور پر عیسائی مبلغین کی ان کمپنیوں نے بھرپور مدد کی اور اسی کے ساتھ ان مبلغین کو ہدایت کی کہ وہ کوئی قدم ایسا نہ اٹھائیں جس سے کمپنی کے مفادات متاثر ہوں یا ہندوستانیوں کو دینی حیثیت سے انگریزوں کے خلاف فتنہ و فساد کا موقع ملے، ۱۷۵۵ء تک اس پالیسی پر عمل ہوتا رہا، لیکن جوں جوں انگریز کمپنیوں کی طاقت اور اثر و نفوذ میں اضافہ ہوتا گیا عیسائی مبلغین کو بھی آہستہ آہستہ ڈھیل دی جاتی رہی، اس کے بعد یہ ہدایات جاری کی گئیں کہ دعوتی جد و جہد ان علاقوں میں انجام دی جائیں جہاں غیر مسلموں کی آبادی ہے۔ مسلم آبادی میں تبلیغی کام قطعاً نہ کیا جائے، اس طرح بڑی خاموشی سے پورے ملک میں گرجا گھر، تعلیمی ادارے اور شفا خانے بڑی تعداد میں قائم کر دیے گئے۔ ۱۷۹۲ء، ۱۷۹۵ء اور ۱۷۹۹ء میں مختلف ناموں سے عیسائی تبلیغ کی انجمنیں قائم کی گئیں اس کے بعد ہی یورپ و امریکہ، اور جرمنی سے بڑی تعداد میں عیسائی مشنریز نے ہندوستان پر یورش کر دی لیکن ان کے سامنے یہ اہم سوال تھا کہ کن لوگوں سے کام کا آغاز کیا جائے، آیا عام لوگوں میں تبلیغ کی جائے یا روشن خیال، مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کو عیسائیت کی دعوت دی جائے، آخر میں اس بات کا فیصلہ ہوا کہ کم سن بچوں کو خرید کر یا زبردستی اغوا کر کے انھیں عیسائی بنانا زیادہ مفید ہے، لیکن لارڈ منٹو کو یہ منصوبہ پسند نہیں آیا، کمپنی کے عیسائی مبلغین اور برطانوی حکومت لارڈ منٹو کے ان خیالات سے متفق نہ ہو سکی، البتہ اس نے عیسائی مبلغین کو متنبہ کر دیا کہ اصل خطرہ کیتھولک مبلغین سے ہے جو کمپنی کے تابع نہیں ہیں، اس لیے اس کا اندیشہ ہے کہ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک مبلغین کے درمیان مسابقت کا جذبہ ہندوستانیوں کے دینی جذبے کو ٹھیس پہنچا دے، لہذا کمپنی کے مبلغین کا پہلا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ کیتھولک مبلغین کی دعوتی جد و جہد کو حدود میں رکھیں، اور پروٹسٹنٹ مبلغین کی ہر طرح مالی اعانت اور سرپرستی کریں۔ چنانچہ کیتھولک مبلغین کی سرگرمیاں کم ہوئیں تو یورپ و امریکہ سے آنے والی امداد بھی کم ہو گئی، اب پروٹسٹنٹ مبلغین کے سامنے میدان صاف تھا، کمپنی نے بھی ان کی کھل کر سرپرستی کی، اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان عیسائی دعوت کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ اسلامی عقائد، شخصیات، تاریخ و تہذیب کے ساتھ قرآن مجید اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو شکوک و شبہات کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ یہ جد و جہد زیادہ تر دیہی علاقوں کے

سادہ دل مسلمانوں میں مرکوز رکھی گئی تا کہ ان کے اسلامی عقائد متزلزل ہو جائیں اور وہ آسانی سے عیسائیوں کے جال میں پھنس جائیں۔

عیسائی مشنریز کو ابتدائی مرحلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی زبردست تائید و حمایت حاصل رہی، ۱۸۵۸ء کے بعد حکومت نے سرکاری سطح پر یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انگریز حکام فوجیوں اور سرکاری عہدیداروں کو وقتاً فوقتاً یہ حکم دیتے رہتے تھے کہ عیسائی مشنریز کی تائید و حمایت جاری رکھی جائے۔ لارڈ منٹو کے عہد میں عیسائی مشنریز کے خلاف فساد میں تیس انگریز مارے گئے تو حکومت برطانیہ نے عیسائی مشنریز کی جدوجہد اور سرگرمیوں کو مزید تیز تر کرنے اور ان میں تنظیم پیدا کرنے کے لیے یہ حکم جاری کیا کہ ہندوستان تبلیغ کے لیے وہی مبلغ جا سکتا ہے جس کے پاس حکومت کا آرڈر ہو، حکومت نے اس مقصد سے ایک بڑے پادری کو متعین بھی کر دیا تا کہ وہ تبلیغی سرگرمیوں میں مشورہ دے سکے، لارڈ کیننگ نے اس کا عہد کیا تھا کہ تین سال کے اندر پورے ہندوستان کو عیسائی اکثریت میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ ایک برطانوی ممبر پارلیمنٹ نے ۱۸۵۷ء میں اس کا اظہار کیا تھا کہ آج سے پورا ہندوستان انگریزوں کے زیر نگیں ہے، اب پورے ملک پر حضرت مسیح کا پرچم لہرایا جائے گا۔ اب ہم تمام عیسائیوں کا یہ بنیادی فریضہ ہے کہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔ ایک رپورٹ میں اس بات کا اشارہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے عیسائی مبلغین بڑے امن و سکون سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، اس لیے کہ حکومت برطانیہ کی سرپرستی اور حمایت میں وہ یہ کام انجام دے رہے ہیں۔

صلیبی جنگوں میں ناکامی کے بعد مسیحی دنیا نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف انتقام لینے کے لیے جو منصوبہ سازی کی تھی اس کے کرتا دھرتا اسپینی پادری ریمون للی تھے جنھوں نے اسپین میں مسلمانوں کے وجود کو تحلیل کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ریمون نے پاپائے روم کے سامنے جو منصوبہ پیش کیا اس میں گرجاگھروں سے اس بات کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ تعلیمی و ثقافتی مراکز کو عیسائی دعوت کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کے لیے استعمال کیا جائے، اگر تعلیم و تربیت کے وسائل استعمال کرنے کے بعد بھی مسلمان عیسائی نہ بنیں تو بہ جبر و اکراہ انھیں عیسائی بنایا جائے۔ یہ منصوبہ

عیسائی مبلغین کے ذہنوں پر عرصہ تک چھایا رہا، بالآخر پادری گریگورس شانزدہم نے سنہ ۱۸۳۱ء میں تعلیمی مشنریز کی تشکیل کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی، پھر سنہ ۱۸۰۸ء میں پادری لیون نے عیسائی مبلغین کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ ہر قسم کی علمی سندیں حاصل کر سکتے ہیں تاکہ مسیحی عقائد کی ترویج واشاعت کا کام وسیع پیمانہ پر کر سکیں، اس کے بعد تجربات سے اس بات پر تمام مبلغین کا تقریباً اتفاق ہو گیا کہ تعلیمی اداروں کے ذریعہ ذہین مسلمان نوجوانوں کو متاثر کیا جا سکتا ہے، شہروں اور دیہاتوں میں بہت آزادی اور اطمینان سے یہ کام انجام دیا جا سکتا ہے، چنانچہ بڑے پیمانہ پر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تعلیم و تربیت کے ادارے قائم کیے گئے، سنہ ۱۹۰۰ء تک ہندوستان میں عیسائی مشنریز کے زیر انتظام چلنے والے تعلیمی اداروں کی تعداد ایک ہزار، اور ان میں تعلیم پانے والے طلباء اور طالبات کی تعداد ۶۵ ہزار پہنچ چکی تھی۔ آگرہ، اودھ، الہ آباد، حیدرآباد اور مدراس میں ایسے معیاری تعلیمی ادارے تھے جہاں عیسائی مبلغین کو مسلمانوں کے درمیان تبلیغ کے لیے تیار کیا جاتا تھا، ان مدارس کے پہلو بہ پہلو عیسائیوں کے زیر انتظام شفاخانے بھی تھے۔ ان سب کا مجموعی بجٹ بیس لاکھ ڈالر سالانہ تھا۔ مسیحی شفاخانوں میں کام کرنے والی نرسوں کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ سال میں کم از کم چھ ہزار خاندانوں سے ذاتی ربط پیدا کریں خصوصاً خواتین کو مختلف عیسائی تقریبات میں مدعو کر کے ان کے ذہنوں کو عیسائیت کے لیے ہموار کریں، سالانہ تیس ہزار خواتین کے مفت علاج کی سہولت بھی ان شفاخانوں میں مہیا کی گئی تھی۔

انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے اور نئے نصاب تعلیم کی تنفیذ کے بعد انگریزی حکومت کو ایسے افراد ملنے شروع ہو گئے جو ذہن و فکر اور ذوق کے اعتبار سے نیم انگریز تھے جو دین اور اخلاقی قدروں کا مذاق اڑانے کو فیشن سمجھتے تھے، ان کے ذریعہ اسلامی عقائد اور تاریخ و تہذیب کو بے اعتبار ثابت کرنے کی مہم چلائی گئی جو بڑی کامیاب رہی۔ ایک پادری نے ایک خط میں لکھا ہے کہ ہم ہندوستان اس لیے نہیں آئے کہ یہاں کے باشندوں کے ساتھ کوئی بھلائی کریں، بلکہ ہم نے ان پر ایسا تعلیمی نظام مسلط کر دیا ہے جو رفتہ رفتہ ان کے دینی و اخلاقی قدروں کو ختم کر کے زوال کے آخری درجہ تک ان کو پہنچا دے گا۔

ان مشنری اسکولوں کو چلانے کے لیے انگریزی حکومت نے اپنی جیب سے ایک پیسہ

بھی خرچ نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کے مدارس اور مساجد کے اوقاف کو ضبط کر کے ان کی ساری آمدنی بلکہ عمارتوں کو بھی عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وقف کر دیا، جو مسلمان امراء اور نواب اسلامی مدارس کی امداد و اعانت کرتے ان کو سخت دھمکیاں دی جاتیں، بسا اوقات معمولی غلطیوں پر مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کو بند کر دیا جاتا، اس طرح بڑی تعداد میں مسلمان اپنے تعلیمی مراکز سے محروم ہو گئے۔"

عیسائی مبلغین نے عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے عربی، فارسی، اردو اور ہندی میں بڑے پیمانہ پر ایسی کتابیں شائع کیں جو مسیحی عقائد پر مشتمل تھیں، اسی کے ساتھ اسلامی عقائد وارکان، تاریخ و تہذیب اور قرآن اور وحی و رسالت کے بارے میں شکوک و شبہات اور اعتراضات اٹھائے گئے تھے، تورات کے لاکھوں نسخے چاروں زبانوں میں کتابی شکل میں شائع کر کے ڈاک کے ذریعہ عوام و خواص میں اور پادریوں کے ذریعہ بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں تقسیم کیے گئے، جنرل مارٹن نے سب سے پہلے تورات کا ترجمہ اردو فارسی میں کیا تھا، ۱۸۰۴ء میں جو عیسائی انجمن تورات کی نشر و اشاعت کے لیے قائم ہوئی تھی اس کے ایک کارکن نے اس کا اعتراف کیا کہ ۱۹۰۹ء تک اس انجمن نے مختلف علاقائی زبانوں میں تورات کا ترجمہ کر کے ۱۹ کروڑ کی تعداد میں تقسیم کیا تھا۔

عیسائی مبلغین کے قلم سے جو کتابیں مسیحی عقائد کی تعلیم و تبلیغ اور اسلامی عقائد و شخصیات کے متعلق تشکیک و اعتراض سے متعلق شائع کی گئیں، ان میں بی جی اسکاٹ کی 'تصدیق الکتاب'، پادری یونس کی 'البراہین الآنیة' اور پادری ڈاکٹر فنڈر کی 'میزان الحق'، 'مفتاح الاسرار'، 'حل الاشکال'، 'اظہار الدین النصرانی' کی 'طریق الحیاۃ' نے ہندوستانی مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ جن مسلمانوں یا غیر مسلموں نے مسیحیت کو قبول کیا تھا ان کے قلم سے بھی اسلام کے خلاف متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ انگریزوں نے سرسید کی تفسیر اور تبیان الکلام کو بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا کر سرسید نے موخر الذکر کتاب میں انجیل میں تحریف سے انکار کیا ہے۔

ان تصنیفات کے علاوہ انگریزی روزناموں، ہفت روزہ اور ماہناموں کے ذریعہ بھی عیسائیت کی تبلیغ و ترویج، اور دینی و اخلاقی قدروں کے خلاف ذہن تیار کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔

مسیحی مبلغین نے بڑے پیمانے پر لائبریریاں اور دار المطالعے قائم کیے، ان کے ذریعہ خاموشی سے نوجوانوں کو مسیحی عقائد سے باخبر اور مانوس کیا جاتا، قادیانیوں، اہل بدعات، منکرین حدیث، ہندو احیاء پرستوں اور مغربی تہذیب و کلچر کے داعیوں کی بھی سرپرستی اور ہمت افزائی کی جاتی۔

جہاں تک سرکاری عہدوں پر مسلمانوں کو فائز کرنے کا تعلق ہے تو کسی مسلمان کو پادری کی سفارش اور تزکیہ کے بعد ہی کوئی عہدہ دیا جاتا۔ حکومت نے یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ اگر کسی عہدہ کے لیے انگریز نہ مل سکیں تو اس جگہ پارسی کو متعین کیا جائے۔ اگر پارسی بھی نہ ملے تو ہندوؤں کو، اگر ہندو بھی نہ ملیں تب مسلمانوں کو وہ جگہ دی جائے۔ ہنٹر نے لکھا ہے کہ بنگال ہائی کورٹ میں انگریز اور ہندو ججوں کی تعداد اکیس تھی، ان میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا، مسلمان عہدیداروں کے خلاف غیر مسلموں کو جاسوس مقرر کر دیا جاتا، جو ہر لمحہ کی رپورٹ حکومت کو دیتا رہتا۔

پادری فنڈر اور اس کی کتاب میزان الحق:

ڈاکٹر فنڈر امریکن نژاد کیتھولک تھا، اس نے انگلستان کو وطن بنانے اور اپنی برطانوی بیوی کی خوشنودی کے لیے کیتھولک مسلک ترک کر کے پروٹسٹنٹ مسلک اختیار کر لیا تھا، اس کے بعد ہی چرچ آف انگلینڈ نے اسے مسیحی مبلغین کا سربراہ بنا کر ہندوستان بھیج دیا جہاں اس نے تبلیغی جدوجہد میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی، اسی بنا پر فنڈر کو ان تین خطرناک اور سرگرم مسیحی مبلغین میں شمار کیا جاتا ہے جنھوں نے غیر معمولی جدوجہد کر کے ہندوستان میں عیسائیت کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

فنڈر کی آمد سے قبل جیروم ہندوستان آچکے تھے اور انھوں نے لاہور کو مرکز بنا کر توحید، تثلیث، الوہیت مسیح اور کتب مقدسہ کی صحت کے متعلق مسلمان علماء کے ساتھ بحث ومناقشہ کا دروازہ کھول دیا تھا۔

اس کے بعد ہنری مارٹن کی آمد ہوئی جس نے فارسی اور اردو میں انجیل کا ترجمہ کر کے

عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کے لیے اس ملک میں ایک مستحکم بنیاد ڈالی، پھر ڈاکٹر فنڈر نے اپنی کتاب میزان الحق کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ اس کے بعد مفتاح الاسرار بھی لکھی، پھر تو دہلی و آگرہ اور لکھنؤ کے علماء کے ساتھ بحث ومناظرہ کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا، بہت سے مسلمانوں کے عقائد متزلزل ہو گئے، اس کی وجہ سے عیسائی مبلغین اور حکومت کی نگاہ میں فنڈر کا وقار واعتبار بڑھ گیا، خود فنڈر کو بھی اس بات پر فخر وغرور تھا کہ وہ فارسی اور اردو زبان سے واقف ہے۔

فنڈر نے ہندوستان میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز عوامی اجتماعات میں تقریروں سے کیا، ہندو مسلمانوں کی تقریبات، میلوں ٹھیلوں میں بھی وہ تقریریں کر کے اسلامی عقائد کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرتا اور سامعین کو یہ مشورہ دیتا کہ وہ مسیحی عقائد کو قبول کر لیں جو شخص مسیحی عقائد پر ایمان لائے بغیر اس دنیا سے چلا جائے گا وہ گناہوں کا بوجھ اپنے سر پر لاد کر اس دنیا سے جائے گا۔ پادری فنڈر کی جرأت اس درجہ پہنچ گئی کہ وہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر مسلح پولیس کی نگرانی وحمایت میں تقریریں کر کے مسلمانوں کو مسیحیت قبول کرنے کی دعوت دیتا۔ پولیس والے زبردستی دوکانوں اور شاہراہوں سے لوگوں کو جمع کر کے پادری فنڈر کی تقریر سننے پر مجبور کرتے۔

فنڈر کے تربیت یافتہ مبلغین دیہاتوں میں بھی جا کر مسیحی دعوت کو پھیلاتے، جنوبی ہند کے شہروں میں انگریزی زبان میں تعلیم یافتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کو خطاب کیا جاتا۔ فنڈر کے کام میں وہ لوگ خاص طور پر معاون ومددگار ہوتے جو اسلام سے مرتد ہو کر عیسائی بن چکے تھے ان لوگوں میں صفدر علی، عمادالدین، سید عبداللہ آتھم، منشی محمد حنیف موسیٰ احمد مسیح کے ساتھ ڈاکٹر برخوردار خان قابلِ ذکر ہیں۔

جن ہندوستانی علماء نے فنڈر کی کتاب 'میزان الحق' کی تردید میں لکھا ان میں ناصر الدین ابو المنصور دہلوی، شیخ محمد آل حسن رضوی شامل ہیں۔ لیکن مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی شخصیت اور تصنیفات نے عیسائی مبلغین اور عیسائی دعوت وتبلیغ کی راہ میں کوہ گراں کھڑا کر دیا۔

آل حسن رضوی کی کتاب استفسار کے مطالعہ سے فنڈر نے اندازہ لگا لیا کہ اس کی کتاب

میزان الحق میں کچھ بنیادی خامیاں ہیں، اس لیے اس نے اپنی کتاب کا از سر نو جائزہ لے کر بعض عبارتوں کو حذف کر کے اکبرآباد (آگرہ) سے فارسی میں نیا ایڈیشن ۱۸۴۹ء میں شائع کر دیا، اس کے ایک سال بعد ۱۸۵۰ء میں اردو ترکی ایڈیشن بھی شائع ہو گیا۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی اور دیگر علماء نے میزان الحق پڑھنے والوں کو تنبیہ کیا کہ اس کتاب میں بعض مقامات پر نقل اصل کے مطابق نہیں ہے، جو شخص اس ترمیم واضافہ سے واقف نہیں وہ یہ سمجھے گا کہ تردید اور نقل کرنے والوں نے عبارت کے نقل میں غلطی کی ہے حالاں کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ تردید کرنے والوں نے جو عبارتیں نقل کی ہیں وہ صحیح ہیں، البتہ میزان الحق کے مصنف نے ان عبارتوں کو نئے ایڈیشن میں یکسر تبدیل کر دیا ہے جن کے جوابات علماء نے دے دیے تھے، جب فنڈر کو اپنے دلائل کے بودے پن کا احساس ہوا تو اس نے ان عبارتوں کو اس طرح حذف کیا کہ یہ پتہ نہ چل سکے کہ کون سی عبارت کس ایڈیشن میں تھی۔ نئے ایڈیشن میں پرنٹ لائن اور سنہ طباعت بھی نہیں۔

میزان الحق کا جو نسخہ دار الکتب المصریہ قاہرہ میں ہے اس کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقدمہ میں تین فصلیں ہیں اور پوری کتاب تین ابواب پندرہ فصول پر مشتمل ہے۔

چند مرکزی عنوانات اس طرح ہیں: انسان کی روحانی ضروریات اور قلبی شوق کی تسکین دنیاوی لذتوں سے ممکن نہیں۔ عقل انسانی سے خدا کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ عہد قدیم وجدید کی کتابیں نہ تو منسوخ ہیں اور نہ ہی ان میں تحریف ہوئی ہے۔ قرآن، تورات وانجیل کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ تورات وانجیل میں کبھی نسخ نہیں ہوا۔ مسیح نے نجات کا راستہ کیسے تلاش کیا۔ تورات وانجیل کے کلام اللہ ہونے کے دلائل۔ دنیا میں مسیحی تعلیمات کیسے پھیلیں۔ کیا مسلمانوں کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ محمد کی رسالت کی پیشین گوئی تورات وانجیل میں کی گئی تھی؟۔ قرآن کے معانی واحکام اور خبریں۔ محمد کے اوصاف اور ان کے اعمال۔ اسلام کیسے پھیلا؟۔

ترتیب و ترجمانی: مولانا شفیق الرحمن ندوی

مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی ؒ

ایک کامیاب مناظر

مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی نادرۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے، وہ ایک پُرجوش و صاحب ولولہ داعی و مبلغ تھے، ایک بلند پایہ مصنف اور کامیاب مناظر تھے۔ انتہائی پُرآشوب دور میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کے دفاع اور ردِّ عیسائیت کا محاذ سنبھالا، پوری زندگی اسی مشن کے لیے وقف کر دی، بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کیا، اس زمانے میں عیسائیت کے خلاف زبان کھولنا آسان نہ تھا، جان جوکھوں میں ڈالنے کا کام تھا۔ حق یہ ہے کہ بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ اسلام کے دفاع کا فریضہ انجام دیا، مشہور عیسائی پادری ڈاکٹر فنڈر (FUNDER) کے ساتھ تاریخ ساز مناظرے نے انھیں شہرت دوام بخشی، جس میں اللہ تعالیٰ نے انھیں فتح مندی و سرخروئی سے نوازا اور ڈاکٹر فنڈر جیسے عالمی شہرت کے حامل مناظر کو ہزیمت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا، یہی نہیں بلکہ ہزیمت اور پسپائی کے احساس کے زخم نے اسے ہندوستان سے رختِ سفر باندھنے پر مجبور کر دیا، مناظرہ کی تفصیلات قارئین گزشتہ اوراق میں ملاحظہ فرما چکے، ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں، البتہ اس مناظرہ سے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کی جو شخصیت نکھر کر سامنے آتی ہے اسے ہم ڈاکٹر عبدالقادر خلیل کے پی۔ ایچ ڈی کے عربی رسالہ کی مدد سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

دو متضاد شخصیتیں:

جن لوگوں نے اس مناظرہ کی کارروائی کا مطالعہ کیا ہے انھیں صاف محسوس ہوگا کہ اس میں بالکل دو متضاد شخصیتیں ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں، ایک شخصیت مولانا رحمت اللہ صاحب

عثمانی کیرانوی کی ہے جو اسلام کی نمائندگی۔ اخلاق، اوصاف، صبر و تحمل، اور اسلامی تعلیمات غرض ہر پہلو سے کر رہی ہے، ایک عالم دین کی شان پورے طور پر جلوہ گر نظر آتی ہے، ان کی زندگی اور شخصیت کی تعمیر میں قرآن مجید اور اسوۂ رسولؐ کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں، نہ غیظ و غضب کا اظہار نہ بے صبری و بے قراری کا مظاہرہ، نہ تعلّی اور نہ مجمع کو مرعوب کرنے والی حرکتیں، صبر و تحمل کا ایک پہاڑ ہے جو حریف کی اوچھی حرکتوں سے متاثر ہونے کے لیے تیار نہیں، اسے اپنے حق پر ہونے اور مدمقابل کے باطل پر ہونے کا مکمل یقین اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظفرمندی پر پورا بھروسہ ہے۔

دوسری شخصیت ڈاکٹر فنڈر کی ہے جو اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی نمائندگی کر رہی ہے، جو اپنی بے سند اور تحریف شدہ کتابوں کی طرف سے دفاع کی ناکام کوشش کر رہی ہے، ڈاکٹر فنڈر کی شخصیت کی تعمیر اور ذہن سازی میں تحریف شدہ کتابوں اور غلط و بے اصل عقائد نے جو کردار ادا کیا ہے اس کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔

پہلے روز مناظرہ کے آغاز میں ڈاکٹر فنڈر نے جو تقریر کی وہ اس کی مرعوبیت، انفعالی کیفیت اور ذہنی انتشار کی پوری طرح غماز ہے، اس نے چاہا کہ شروع ہی میں اپنے حریف اور دوسرے سامعین کو اپنے بلند بانگ دعووں اور تعلّیوں کے ذریعہ مرعوب کرلے۔ پھر اس کے بعد اپنے کند ہتھیاروں سے اپنے حریف کو زیر کرلے۔ چنانچہ ابتدا ہی میں اس نے سارے ہندوستان کے مسلمان علماء کو چیلنج کیا، اور کہا کہ اس مناظرہ کا نتیجہ پہلے سے معلوم ہے، اس مناظرہ کا کوئی حاصل نہیں ہے کیوں کہ کوئی مسلمان عالم ہمارے سامنے ٹک نہیں سکتا ہے، صرف مولانا رحمت اللہ صاحب کی خواہش پر مناظرہ میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی ہے تاکہ مناظرہ کرنے کی ان کی خواہش پوری ہوجائے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر فنڈر انتہا درجہ مرعوب ہوچکا ہے اور ذہنی و اعصابی تناؤ کا شکار ہے چنانچہ مناظرہ کے دوران وہ بات بات پر خفگی کا اظہار کرتا، اشتعال انگیز حرکتیں کرتا، مقصد یہ تھا کہ کسی طرح مولانا رحمت اللہ صاحب اشتعال میں آجائیں اور اسے بہانہ بناکر راہ فرار اختیار کرنے کا موقع مل جائے۔

ڈاکٹر فنڈر کے برعکس مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے اپنی تقریر کا آغاز پرسکون علمی انداز میں

کیا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میدانِ کارزار میں قدم رکھنے سے پہلے اچھی طرح تیاری کر لی ہے، ایک ماہر جنرل کی طرح پوری طرح واقف تھے کہ حریف کون کون سے حربے استعمال کرے گا اور اس کی کاٹ کیسے کی جائے گی۔ انھوں نے نہ صرف اسلام کی حقانیت کے دلائل و شواہد پیش کیے بلکہ عیسائی مبلغین جن میں اس وقت سرفہرست ڈاکٹر فنڈر تھا اور جس نے پوری تیاری کے ساتھ ترکی اور برصغیر کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کا بیڑہ اٹھایا تھا اس کے اعتراضات کا جواب اہلِ کتاب کی معتبر کتابوں اور عیسائی مصنفین کی تحریروں سے پیش کر کے ان کو ششدر کر دیا بلکہ میدان سے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ واقعہ ہے کہ مولانا کے علمی اور باوقار انداز نے ان کی کامیابی اور ظفر مندی میں اہم رول ادا کیا۔

غیر معمولی ذہانت اور قوت حافظہ:

اس تاریخ ساز مناظرے کے دوران میں مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ نے قدیم عیسائی مصنفین اور خود ڈاکٹر فنڈر کی تصنیفات سے بیس سے اوپر حوالے پیش کیے، مسلمان علماء و مصنفین کی کتابوں اور تفاسیر سے متعدد شواہد نقل کیے، یہ سارا کام اپنی یادداشت سے کیا، کہیں کتاب کھولنے کی نوبت نہیں آئی۔ لطف کی بات یہ کہ کہیں حریف کو اعتراض کرنے کا موقع نہیں دیا کہ یہاں حوالہ دینے میں کمی یا بیشی ہوئی ہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری عبارتیں نوکِ زبان ہیں، ان کی ذہانت اور قوتِ حافظہ کا یہ مظہر دیکھ کر حاضرین ششدر رہ گئے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر فنڈر اور اس کے معاون و شریک مناظرہ فرنگ کو شواہد پیش کرنے کے لیے بار بار کتابوں کے اوراق الٹنے پلٹنے کی ضرورت پیش آئی، وہ اپنی یادداشت سے ایک حوالہ پیش کرنے پر قادر نہ تھا دیگر تصنیفات کا معاملہ الگ رہا ڈاکٹر فنڈر خود اپنی عبارتیں اپنی یادداشت سے سنانے پر قادر نہ تھا اس نے کتاب کھول کر پڑھ کر سنایا۔ حاضرین کے لیے تفریح طبع کا سامان اس وقت مہیا ہوتا جب ڈاکٹر فنڈر اپنے دعویٰ کی دلیل میں کوئی حوالہ پیش کرنا چاہتے تھے لیکن ناکام رہے، بالآخر مولانا کو ترس آیا اور انھوں نے فرمایا غالباً آپ جو حوالہ دینا چاہتے ہیں وہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر ہے اپنی یادداشت سے انھوں نے

وہ عبارت پڑھ کر سنادی۔

مناظرہ کے مشمولات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جن مسائل پر گفتگو کر رہے ہیں اس کے جملہ پہلوؤں سے آگاہ ہیں، موافقین اور مخالفین کے آراء، اعتراضات اور ان کے جوابات سے پوری طرح لیس تھے۔ چنانچہ جب بھی کوئی مسئلہ زیر بحث آیا تو انھوں نے پوری تفصیل سے روشنی ڈالی، اور بتایا کہ فلاں فلاں عیسائی علماء اور مصنفین اس مسئلہ کی حمایت وتائید میں ہیں اور فلاں فلاں عیسائی علماء اس کے مخالف ہیں، ہر ایک کا نقطۂ نظر وضاحت کے ساتھ بیان کیا اور بتایا کہ اس مسئلہ میں محققین کی رائے یہ ہے۔ یہ محض دعویٰ بلا دلیل نہ تھا، ہر ایک کی دلیل ان کی معتبر کتابوں سے پیش کی۔ شواہد پیش کرتے وقت انھوں نے التزام کیا کہ کتاب کا نام، مصنف کا نام، کتاب کہاں سے طبع ہوئی ہے، اور کس سن میں طبع ہوئی ہے، اور یہ کتاب کا کون سا ایڈیشن ہے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کی۔ اسی طرح عہد قدیم (توریت) اور عہد جدید (انجیل) کا حوالہ دیتے وقت کتاب، باب اور آیت کا حوالہ دینے کا اہتمام کیا۔ مذکورہ مناظرہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب نے عہد قدیم اور عہد جدید دونوں سے تقریباً پندرہ شواہد پیش کیے، عبارتیں اپنی یادداشت سے پڑھ کر سنائیں، جب کہ ڈاکٹر فنڈر اور اس کے معاون نے پہلے سے تحریر کردہ عبارتیں اوراق دیکھ کر پڑھیں۔ حد تو یہ ہے کہ اپنی ہی تصنیف کردہ کتاب میزان الحق سے قرآن پاک کی زیر حوالہ آیات پڑھنی شروع کیں تو ڈاکٹر نے کئی جگہ غلطیاں کیں اور مولانا نے اصلاح فرمائی۔

نسخ اور تحریف جیسے اہم اور بنیادی قضیہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب نے دسیوں حوالے اور شواہد پیش کر کے اپنے دعوے کو ثابت کیا۔ جزوی مسائل مثلاً کسی خاص حکم کا نسخ، کسی جملہ یا آیت میں تحریف وتغییر کے اثبات کے لیے بھی دو دو، تین تین شواہد پیش کر کے انھوں نے ثابت کر دیا کہ اپنے دعویٰ کے اثبات اور حریف کے دعوی کے ابطال کے لیے انھوں نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے تیاری کی ہے۔ فریق مخالف کی کتابوں سے ایسے حوالے اور دلائل پیش کیے جہاں دوسرے کا ذہن بھی نہ گیا تھا۔ ان کے اس عمل نے مخالفین کو ششدر کر دیا۔

مناظرہ کے دوران میں مولانا کا یہ کمال بھی مشاہدہ میں آیا کہ شواہد کی فراہمی میں تنوع کا خاص

خیال رکھا، ان کے یہاں تکرار نہیں تھی، ایک دلیل یا شاہد جب ایک مرتبہ پیش کر دیتے تو دوبارہ اس کا اعادہ نہیں کرتے، ہر موقع پر انھوں نے بالکل نئی دلیل پیش کی اور نیا حوالہ دیا، معلوم ہوتا کہ دلائل اور شواہد ان کے سامنے صف بستہ کھڑے اشارہ کے منتظر ہیں، دلائل وشواہد کے اس تنوع نے حاضرین پر خوش گوار اثر ڈالا۔ وہ اکتاہٹ کا شکار نہ ہوئے۔ دوسری طرف ان کے خاص حریف ڈاکٹر فنڈر کو اپنی بے بضاعتی کا شدت سے احساس ہوا، کیوں کہ وہ ہر جگہ اور ہر موقع پر پامال حوالے ہی پیش کرنے پر مجبور تھے۔

دوران مناظرہ مولانا کا طریقہ کار یہ تھا کہ یا تو عقل وفلسفہ سے مؤید دلیل پیش کرتے یا عہد قدیم اور عہد جدید کی ایسی کتابوں سے شاہد پیش کرتے جن کو فریق مخالف بھی تسلیم کرتا ہے یا ایسے عیسائی علماء کے اقوال اور ان کی تحریریں پیش کرتے جو ڈاکٹر فنڈر کی نظر میں بھی ثقہ اور معتبر تھے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ زیر بحث تحریر میں اول مولانا نے اپنا دعویٰ پیش کیا، فریق مخالف نے انکار کیا، مولانا نے اپنے دعوی کے اثبات میں تورات وانجیل کے حوالے پیش کیے۔ ڈاکٹر فنڈر نے پھر بھی دعوی تسلیم کرنے سے انکار کیا تو مولانا نے عیسائی علماء کی تحریریں پیش کیں جن سے مولانا کے دعوی کی تائید ہوتی تھی، اس طرح مولانا نے ڈاکٹر فنڈر کے لیے فرار کی راہیں مسدود کر دیں۔ بارہا ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ ایک دلیل کے بعد دوسری اور تیسری دلیلیں پیش کر دیں، تاکہ دعوی کے اثبات میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ وہ یہ بھی ارشاد فرماتے کہ ہمارے پاس زیر بحث مسئلہ میں دلائل کی کمی نہیں ہے وہ مزید شواہد پیش کر سکتے ہیں لیکن تضییع اوقات سے بچنے کے لیے صرف دو چار شواہد پر اکتفا کیا ہے، یہ صورت حال ڈاکٹر فنڈر کے لیے پریشان کن تھی وہ زچ ہو کر اعصابی اور ذہنی تناؤ کا شکار ہو جاتا۔

بیدار مغزی اور حاضر جوابی:

متنازع فیہ مسائل میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے دلائل برمحل، طاقت ور اور واضح تھے، اس میں کسی قسم کا ابہام تھا اور نہ کسی تاویل کی گنجائش تھی، اور نہ ہی مقصود ثابت کرنے کے طول طویل بحث کی ضرورت تھی، اس کے نتائج ریاضی کی طرح واضح اور متعین برآمد ہوتے، اس کے برعکس ڈاکٹر فنڈر کے پیش کردہ دلائل بے محل اور غیر واضح تھے، اسے اپنا مقصد ثابت کرنے کے لیے طول طویل

تقریر کرنی پڑتی، خاصا تکلف سے کام لینا پڑتا، ایسا معلوم ہوتا کہ زبردستی ایک مفہوم اخذ کیا جارہا ہے، ایسے موقع پر مولانا کی حاضر دماغی کے کرشمے دیدنی ہوتے، وہ اپنے حریف کو گرفت میں لانے کے لیے عہد قدیم اور عہد جدید کے حوالوں کے درمیان موازنہ کرکے اپنا دعویٰ ثابت کرتے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اس دلیل کا جواب طویل عرصہ سے تیار کیے ہوئے ہیں۔

بارہا یہ دیکھنے میں آیا کہ مولانا نے عیسائی علماء کی تحریریں پیش کیں، ڈاکٹر فنڈر نے تسلیم کرنے کی بجائے ان عیسائی علماء کو غیر معتبر ثابت کرکے راہ فرار اختیار کی، فن حرب کے ماہر جنرل کی طرح مولانا نے کاٹ کی، حوالہ پیش کرنے سے قبل مولانا دریافت کرتے کہ فلاں مصنف یا پادری کس مرتبے کا حامل ہے، معتبر ہے یا غیر ثقہ۔ جب ڈاکٹر فنڈر اس مصنف کے مرتبہ و مقام کا اعتراف کرلیتا تو اس کے کلام سے اپنی بات ثابت کرتے۔ ایک دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا کہ فرماتے آپ نے فلاں عیسائی مصنف کی تحریریں اپنی کتابوں میں بطور حوالہ پیش کی ہیں بالفاظ دیگر وہ آپ کے نزدیک ثقہ اور لائق بھروسہ ہے۔ زیر بحث مسئلہ میں اس کی رائے یہ ہے۔ مولانا شروع ہی میں ایسی پیش بندی کردیتے کہ حریف کے لیے فرار کی راہیں مسدود ہو کر رہ جاتیں۔ اگر کبھی ڈاکٹر فنڈر نے کہا کہ فلاں عالم کی رائے اس قضیہ میں شاذ ہے کوئی دوسرا اس کا ہم نوا نہیں ہے تو مولانا دیگر عیسائی علماء کی فہرست شمار کرادیتے کہ اس مسئلہ میں سب کی رائے متفق ہے، سب اس کے موید اور ہم خیال ہیں۔

جرأت و بے باکی:

جس وقت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ اور مشہور عیسائی پادری ڈاکٹر فنڈر کے مابین مناظرہ ہوا، وہ مسلمانوں کے لیے تاریک اور پُرآشوب دور تھا، ڈاکٹر فنڈر کی پشت پر پوری عیسائی دنیا تھی، فاتح قوم تھی، برطانیہ عظمیٰ کی سلطنت تھی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے حدود سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا، دوسری طرف مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ کی حمایت میں ایک شکست خوردہ اور مغلوب قوم تھی، ذرائع و وسائل سے فرومایہ، اس کے باوجود کسی موقع پر مولانا کی آنکھ نہیں جھپکی، آنکھ سے آنکھ ملاکر بات کی۔ ایک مسلمان کی دلیری اور ایک عالم دین کی حق گوئی و بے باکی کا پورا مظاہرہ سامنے آیا۔

انتہائی جرأت اور بے باکی کے ساتھ انھوں نے عیسائیت اور اس کے عقائد کی کمزوریاں ظاہر کیں، دلائل کی روشنی میں ان کو بالکل ننگا کر دیا۔ برملا اعلان کیا کہ ان کی کتابیں بے سند اور تحریف شدہ ہیں، اور ان کے درمیان تضادات کی بھرمار ہے، اسی طرح انھوں نے پادری فنڈر کے اقوال اور تحریروں میں تعارض و تضاد دکھانے میں پس و پیش سے کام نہیں لیا، اپنے ایک مکتوب میں جو ڈاکٹر فنڈر کے نام تحریر کیا گیا تھا بصراحت اس کو ذمہ دار قرار دیا کہ آپ محض بہانہ بازی کر کے اور نامعقول شرائط پیش کر کے مناظرہ سے کترا رہے ہیں۔ جب ڈاکٹر فنڈر نے اصرار کیا کہ مناظرہ صرف انجیل سے متعلق ہو سکتا ہے تو انھوں نے سبب دریافت کیا کہ ایسا کیوں؟ ہمارے نزدیک دونوں یکساں نوعیت کی حامل ہیں اور خود آپ نے اپنی کتاب میزان الحق میں گفتگو صرف انجیل تک محدود نہیں رکھی ہے بلکہ دونوں کتابوں میں نسخ اور تحریف کی نفی کی ہے، اب ایسی کیا مجبوری پیش آگئی کہ آپ تورات سے اظہار برأت کر رہے ہیں۔

مناظرہ دو روز جاری رہا۔ پہلے روز کے اختتام پر مولانا نے جرأت اور صفائی کے ساتھ پادری فنڈر سے فرمائش کی کہ یا تو وہ ہمارا تحریف کا دعویٰ تسلیم کریں یا ان ساٹھ مقامات کی توجیہ و تاویل پیش کریں جن کے محرف ہونے کا خود عیسائی علماء نے اعتراف کیا ہے۔ نیز کہا کہ جب تک وہ اپنی کتابوں کی سند نہ بیان کر دیں یا ان کو بے سند ہونا نہ تسلیم کر لیں اس وقت تک تورات و انجیل سے استدلال قابل قبول نہ ہوگا۔

دوسرے روز کے جلسہ کے اختتام پر انھوں نے با آواز بلند اعلان کیا کہ مسلمانوں کے نزدیک تحریف کا جو مفہوم ہے، اس مفہوم کے مطابق ڈاکٹر فنڈر نے دونوں عہد کی کتابوں کا محرف ہونا تسلیم کر لیا ہے، نزاع صرف لفظی باقی رہ گیا ہے۔

اس کے جواب میں ڈاکٹر فنڈر صرف یہی کہہ سکا کہ اس سے اصل متن کو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ بالفاظ دیگر اس نے تحریف کا دعویٰ تسلیم کر لیا، مولانا نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے دو ماہ تک مناظرہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بعد کے خط و کتابت میں بھی پوری قوت سے مناظرہ پر اپنی آمادگی ظاہر فرمائی لیکن دوسری طرف آمادگی کے بجائے ہندوستان سے روانگی کی تیاری شروع ہو گئی۔

حریف کے ساتھ حُسنِ معاملہ:

مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ اسلامی ادب اور اخلاقِ حسنہ کے پیکر تھے، مناظرہ میں "وجادلھم بالتی ھی احسن" کے طریق کار پر کاربند تھے، اپنے حریف کے ساتھ ان کا معاملہ لطف و نرمی کا تھا، مبادا وہ گھبرا کر درمیان ہی میں راہِ فرار نہ اختیار کرلے ڈاکٹر فنڈر نے طول طویل عبارتیں پڑھیں وہ صبر و تحمل اور یکسوئی کے ساتھ سنتے رہے، اس کی ڈرنگ بازیوں اور تعلّیوں کو بھی برداشت کیا، جب فریقِ مخالف نے اپنے ہی علماء کو ناقابلِ اعتبار قرار دے کر ان کے آراء کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تو مطلقاً خفگی کا اظہار نہیں کیا، ڈاکٹر فنڈر ہی کی طرح اس کے معاون فرنگ کو بولنے کا پورا موقع دیتے اور اس کی باتیں سنتے اس کے برعکس فریقِ مخالف کا رویہ شروع سے قابلِ اعتراض رہا اس نے ڈاکٹر محمد وزیر خاں کو بولنے سے روک دیا جب کہ وہ مولانا کے معاون اور شریکِ مناظرہ تھے۔ مفہوم کی تعیین میں بھی مولانا نے حریف کو پوری آزادی دی، جب اس نے ایک مفہوم متعین کردیا تو اسی کی روشنی میں اپنا دعویٰ ثابت کیا۔

ایک کامیاب مناظر کے لیے ذہانت، حاضر دماغی، قوتِ حافظہ، وسعتِ مطالعہ، اور منطقی واستدلالی انداز یہ وہ اسلحہ ہیں جن سے کام لے کر وہ اپنے حریف کو زیر کرتا ہے، خوش قسمتی سے یہ سارے ہی کمالات مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھے، جن کو چابک دستی اور مہارت کے ساتھ استعمال کرکے انھوں نے اپنے حریف مشہور عیسائی پادری ڈاکٹر فنڈر کو شکست دی۔ اس مناظرہ نے برصغیر ہند میں عیسائیت کا سیلاب روکنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ نیز مسلمانوں کے اندر اپنے دین کی حقانیت وابدیت کے بارے میں اعتماد بحال کیا ہے۔ برصغیر کے مسلمان مولانا کے اس عظیم احسان کو کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

ذکر و فکر دہلی

کا یہ خاص اور نادر نمبر جو کہ

مجاہد جنگ آزادی 1857ء

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی ؒ

سے متعلق ہے محترم جناب **خواجہ زاہد ندیم** صاحب

نے فراہم کیا ہے.

اس علمی تعاون پر ہم اُن کے بے انتہا مشکور ہیں

اللہ کریم انہیں اس کی بہترین جزاء عطا فرمائے آمین

محمد احمد ترازی